دھرتی کا دکھ

افسانے

فریدہ زین

سنہ اشاعت ڈسمبر ۱۹۹۴ء
تعداد ۵۰۰
کتابت سنجیدہ بیگم
طباعت اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار۔ حیدرآباد
ناشر فریدہ زین "فروزاں"
مکان نمبر 11-5-49/A۔ ریڈ ہلز حیدرآباد
اے۔ پی۔ 4
سرورق ترتیب و تزئین سعید مرزائی
معاون سلیم مرزائی
قیمت ساٹھ روپیے

یہ کتاب اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش حیدرآباد
کے جزوی تعاون سے شائع ہوئی ہے

ملنے کے پتے

۱۔ فلاورزون ہائی اسکول۔ ریڈ ہلز 500004 فون نمبر 223706
۲۔ الکتاب میور کوشل۔ عابڈس حیدرآباد A-110 حیدرآباد۔ 1
۳۔ ہمالیہ بک ڈپو۔ نامپلی حیدرآباد
۴۔ حیدر اینڈ سنس مچھلی کمان حیدرآباد 500002
۵۔ حسامی بک ڈپو " "
۶۔ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ۔ جامعہ نگر اوکھلہ دہلی 25
۷۔ دانش محل۔ امین آباد پارک لکھنو۔
۸۔ حیا پبلشنگ ہاؤس 178 شواکھنڈ وشواکرما نگر دہلی 110095

تعارف

مصنفہ — فریدہ زین ۔ ایم ۔ اے

بانی و سرپرست — خلاورزون ہائی اسکول ریڈہلز حیدر آباد 500004

تصانیف —

۱۔ سسکتی چاندنی (افسانوی مجموعہ) ۱۹۷۹ء اکتوبر

۲۔ دل سے دار تک (") ۱۹۸۲ء ڈسمبر

۳۔ اے گردش دوراں (") ۱۹۹۱ء اکتوبر

۴۔ دھرتی کا دکھ (") ۱۹۹۴ء ڈسمبر

۵۔ تلاشِ آدم (ناول) زیر ترتیب

۶۔ مضامین کا مجموعہ زیر ترتیب

اعزازات

۱۔ افسانہ "اک چراغ رہ گذر" پر اسٹیج شو ۱۸ مئی ۱۹۷۱ء
پیش کردہ کلاکارز ڈرامیٹک رجسٹرڈ سوسائٹی دہلی
اے۔ آئی۔ ایف۔ اے۔ سی۔ ایس ہال۔ رفیع مارگ۔ دہلی

۲۔ نیشنل انٹیگریشن ایوارڈ۔ منجانب بھارتیہ کلچرل اکیڈمی۔ اے پی ۱۵ر ڈسمبر ۱۹۸۴ء

۳۔ "سرٹیفکٹ آف میرٹ اینڈ موِمنٹو" بدست عالی جناب ڈاکٹر شنکر دیال شرما صاحب (صدر جمہوریہ)
منجانب نیشنل انٹیگریڈ سوسائٹی اے۔ پی ۱۹۸۵

۴۔ ڈرامہ فیسٹول ایوارڈ ۱۹۸۶ "راکھی کی لاج"

۵۔ فری پریس ایڈیٹرس فیڈریشن ایوارڈ ۱۹۸۶ء بہ ضمن "تعلیمی خدمات"

۶۔ انجمن بقائے اردو ایوارڈ ۱۹۸۶ء بہ ضمن "انشا پردازی میں شاعری"

۷۔ "نازدکن" ٹیبلو پیش کش گنبدانِ قطب شاہی بہ ضمن چار سو سالہ جشن حیدرآباد
۲۳ر فروری ۱۹۹۲ء زیر اہتمام قلی قطب شاہ اربن ڈیولپمنٹ اتھاریٹی

و

انٹاک (انڈین نیشنل ٹرسٹ فار آرٹس اینڈ کلچرل ہیریٹیج

افسانے طبع شدہ : شمع، شاعر، بیسویں صدی، خاتون مشرق، روبی، سب رس
بانو، پونم، روشنی، راشٹریہ سہارا (حیدرآباد)

انتساب

اُس درد کے نام

جو کائنات پر محیط ہے

چڑھا وہ درد کا دریا کہ شاخِ خس کی طرح
میرا وجود میرے سامنے بکھرنے لگا

(صلاح الدین ندیم)

زیرِ نظر

جنبشِ لب

دھرتی کا دکھ

اشکِ سنگ

جائے پناہ

نقشِ فریادی

دھماکہ

ایک شیشہ اور لوٹا

درد و درماں

چاند پھر نکلا

دستِ حنا

ٹکراؤ

کرچیاں

ویراں ہے میکدہ

پرواز

طوفاں کے بعد

سائبان

ناآشنا

فن اور مواد میں ارتقا کی داستاں : ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

جُنبشِ لب

جنبشِ قلم سے پہلے جُنبشِ لب کی جسارت کر رہی ہوں۔ کیوں کہ دنیا میں آتے ہی جنبش کی ابتداء آواز سے ہوئی ______ آواز ہونٹوں سے نکلی اور سب کو یقین دلایا کہ ______ کوئی آیا۔

کتاب زندگی کے اوراق شب و روز کی طرح الٹتے جا رہے ہیں۔ سب سے پہلے "سسکتی چاندنی" اتر آئی۔ اس کے بعد "دل سے دل" تک پہنچے اور پھر "گردشِ دوراں" شروع ہوئی۔ اب "دھرتی کا دُکھ" سمیٹ لیا۔

دُکھ کی اپنی آفاقیت ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی نومولود مسکراتا ہوا دنیا میں آیا ہو ______ !! یا تو وہ روتا چیختا آیا ______ یا پھر مفکر کی طرح خاموش ______ جسے رلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ازل سے زندگی اور آنسوؤں کا رشتہ ہے۔ دنیا میں انسان آتا ہے تو خود روتا ہے اور جاتا ہے تو دوسروں کو رلاتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ غم صحرا ہے اور خوشی سراب ——— میرے احساس پر بھی غم محیط ہے اور شاید اسی لیے مجھ پر الم نگاری کی مہر لگ گئی۔ مگر میں بھی کیا کروں مجبور ہوں ——— غم ہی میرا محرکِ قلم ہے شعور میں آتے ہی والد کی اچانک موت نے احساسات کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ——— اور بس یہیں سے طرب و کرب کا کھیل دیکھتی چلی آئی۔ پھر جوان بہن کی اچانک موت اور اس کے بعد شریکِ زندگی زین صاحب نے داغِ مفارقت دے کر میرے نام ہجومِ تنہائی لکھ دی۔ اب جو کچھ بھی بچا وہ صرف یادوں کا سفر ہے۔ قطعِ نظر اس سے زمانے کے بھی رنگ دیکھے ہر جگہ دُکھ کا غلبہ پایا۔ اگر کہیں خوشی نے آنکھ کھولی بھی تو لمحاتی طور پر ——— اکثر لوگوں نے مجھ سے سوال کیا کہ زندگی کے تو دو پہلو ہیں پھر میں نے ایک ہی انداز کیوں اپنایا ———؟ اس میں قصور میرا نہیں ——— میری نظر نے جو دیکھا میرے دل نے جو احساس دلایا۔ میرا قلم اسی کی ترجمانی کر سکتا ہے۔ احساس اور قلم میں بھی ایک مضبوط رشتہ بندھا ہے۔ اس دنیا میں رکھا ہی کیا ہے ——— امارت ہو تو زندگی جشنِ طرب مناتی ہے اور اگر غربت کے جال میں پھنسی ہو تو اسے سانسوں کی تہمت مل جاتی ہے۔ سچائی، انسانیت، بےلوث پیار، اعلیٰ اقدار بےغرض محبت کہاں باقی رہی ——— !! جھوٹ، دغا، فریب دھوکہ اقدار کی پامالی، خودغرضی، نفس پروری کے اس ماحول میں خوشی کہاں ملے گی ———

خوشی کی پناہ گاہ تو دکھ کی آغوش ہے۔ جب تک انسان دکھ کی کیفیت سے نہ گزرے خوشی کا احساس کہاں سے پائے گا۔ اپنی ذات میں مگن رہنے والا خوشی کے مفہوم سے ہی ناآشنا ہوتا

ہے۔ خوشی کا دائرہ تو بہت وسیع ہے اسے محدود نہ سمجھنا چاہیئے۔ کسی کے آنسو اپنے دامن میں جذب کر کے کسی کے زخموں کو مرہم دے کر، کسی بھوکے کو روٹی دے کر، کسی کے درد کو اپنا کر ہم جس کیفیت سے گزرتے ہیں وہی تسکین قلب وجاں ہے اور اسی کا نام شاید خوشی ہے ——

جس کرب سے میں آشنا ہوئی وہ اگر اپنا ہے تو جو دکھ میں نے دیکھا وہ دنیا کا ہے اور جس غم سے مجھے شناسائی ملی وہ زمانے بھر کا ہے۔

شاید اسی لیے میں آج آپ لوگوں کے سامنے "دھرتی کا دکھ" لے کر آگئی۔ یہ دھرتی —— جانے اپنے اندر کتنی صدیوں کا دکھ سمیٹے ہوئے ہے۔ جب سے اولاد آدم نے اس پر قدم رکھا —— دکھوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا۔ ہابیل وقابیل کی آپسی دشمنی، رقابت، حرص وہوس، اقتدار کی چاہ، نفسا نفسی، قتل وخون سے اس کا آغاز ہوا۔

قوموں اور قبیلوں نے نفرت اور دشمنی سے اسے پامال کیا ——

زر وزمین کی حرص نے اسے برباد کیا ——

اقتدار کی ہوس نے اسے لوٹا ——

جنگ وجدل نے اس کا چہرہ مسخ کیا ——

فسادوں نے اس کا گلا گھونٹا ——

شہیدانِ محبت نے اس کے آغوش میں پناہ لی ——

غربت اور افلاس کے مارے اس کے سینے پر کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگتے رہے ——

قحط اور کال سے اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئیں ——

سیلاب اور طوفانوں نے اس کے چہرے کو آنسوؤں سے بھگو دیا ــــــ

قدروں کی پامالی نے اس کے دل پہ گھاؤ لگائے ــــــ

بربریت اور درندگی نے اس کی اولاد کا خون اس کے سامنے بہایا ــــــ

گناہوں نے بدنما داغ اس کے چہرے پر لگائے ــــــ

کسی سیتا کو اس کے سینے پر اگنی پریکشا دینی پڑی ــــــ

کسی ساوتری نے ستی ہونا گوارا کیا ــــــ

کسی مریم کی پاکیزگی کو اس کے سامنے داغدار بنایا گیا ــــــ

کسی زلیخا کو اس کی آنکھوں نے جہیز کے نام پر جلتے دیکھا ــــــ

اس نے ہنگام سحر اور سکوت شب کا ملا جلا کھیل دیکھا ــــــ

بموں کے دھماکوں نے اس کے دل کو دہلا دیا ــــــ

اس کی نظر کے سامنے لب ساحل کشتیاں ڈوبتی رہیں ــــــ

ادھ کھلی کلیاں مرجھاتی رہیں ــــــ

اس کے سینے پر خون میں لت پت لاشیں رکھی گئیں ــــــ

اس کی نگاہوں نے ان گنت دُکھ دیکھے ــــــ

اس کے ماتھے کی بندیا مٹ گئی، آنکھوں کا کاجل بہہ گیا، ہونٹوں کی لالی کھو گئی، ہاتھوں کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں اور آنچل تار تار ہو گیا ــــــ حالاں کہ وہ ایک ماں کی طرح تخلیق کا کرب برداشت کرتی رہی۔ کونپل کے پھوٹنے سے لے کر پھلنے پھولنے تک کے ہر دور کو اس نے دیکھا۔ جتنی اس کی وسعت ہے اس سے زیادہ اس نے دُکھ جھیلے ــــــ

دھرتی کے ان دُکھوں کی کہانی سنانے میں میرے قلم نے کتنا حق ادا کیا ــــــ اس کا اندازہ قارئین ہی لگا سکیں گے۔

اس کتاب میں جملہ پندرہ کہانیاں شامل ہیں۔ تین افسانے "دستِ حنا" "ایک شیشہ اور لوٹا" اور "ویران ہے میکدہ" "سسکتی چاندنی" میں شائع ہو چکے تھے مگر قارئین کے اصرار پر میں نے دوبارہ اس مجموعے میں انھیں شریک کر لیا ہے۔

آج کا دور ذہنی انتشار کا ہے ـــــ ماحول الجھا ہوا۔ خیالات شکستہ نہ سکون نہ پناہ۔ چاروں طرف مسائل کا پھیلاؤ ـــــ سامنا کیسے کیا جائے ـــــ کشاکش حیات کی اس دوڑ میں کون ہارتا ہے کون جیتتا ہے یہ تو وقت جانے ـــــ

اپنے افسانوں کے ہمراہ آپ کے سامنے ہوں اس حوصلے اور یقین کے ساتھ کہ جذبوں کی صداقت اثر ضرور رکھے گی۔

میری بات ادھوری رہ جائے گی اگر میں ان تمام کا شکریہ ادا نہ کرلوں جن کا اس کتاب کی اشاعت پر تعاون رہا ہے۔ سب سے پہلے میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ صاحب کی بے حد ممنون و مشکور ہوں جنھوں نے میری پچھلی تینوں کتابوں کا تفصیلی جائزہ لیا، سیر حاصل تبصرہ کر کے میری ہمت بندھائی۔

میں اپنے بھائی سعید مرزائی کے تعاون کی بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے سرورق سے لے کر ترتیب و تزئین کی پوری ذمے داری لے کر اپنا حق ادا کیا۔ اپنے بھانجے سلیم مرزائی کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں جن کا تعاون ہمیشہ کی طرح مجھے حاصل رہا ـــــ میں بخیدہ بیگم خوش نویس کی بھی مشکور ہوں جنھوں نے پابندی وقت کے ساتھ میرے کام کی تکمیل کی۔ اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کے جزوی تعاون کی بھی مشکور رہوں۔

اختتام سے قبل زین صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کر دوں کہ وہ آج بھی میرے ہر کام میں کیوں کہ میں ـــــ فریدہ + زین = فریدہ زین ہوں ـــــ

فریدہ زین

دھرتی کا دُکھ

"وعدے بھی بڑے عجیب ہوتے ہیں کئی رنگوں میں اس کے جلوے ہیں۔ انسان کو زندہ بھی رکھتے ہیں اور کبھی موت سے ہمکنار بھی کر دیتے ہیں۔ دوستوں کے وعدے تسلی دیتے ہیں۔ لیڈروں کے وعدے جھوٹے خواب دکھاتے ہیں۔ دشمنوں کے وعدے تباہ کرتے ہیں۔ جھوٹے وعدے منجدھار میں رکھتے ہیں۔ جہیز کے وعدے جھلسا دیتے ہیں۔ وفا کے وعدے زندگی دیتے ہیں اور ٹوٹے وعدے موت ———"

دھرتی کا دکھ

چاروں طرف ٹوٹے مکان کے ملبے ہی ملبے تھے۔ کھنڈروں کی یہ بستی عجیب بے بسی کا منظر پیش کر رہی تھی۔ لاشوں کی قطاریں کھلے میدانوں میں یوں رکھی تھیں جیسے راشن شاپ پر خریداروں کا ہجوم، اینٹ مٹی اور پتھروں کے ڈھیر پر بارش کا چھڑکاؤ جاری تھا۔ شاید انسانی زندگی کی پامالی پر فلک بھی اشک بار ہو گیا۔

چیختی ہوئی آوازیں، آہ وزاری، فریاد، بچوں کا شور وغل، بھوک اور پیاس کی صدائیں۔ ہاہاکار ——— اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں۔ شاید جانور بھی اس منظر سے دل خراش ہو کر آواز دینے لگا تھا۔ مکان تو رہے نہیں مکیں جو بچ گئے وہ زندہ درگور تھے۔ ہر ملبے کے ڈھیر کے سامنے چار پانچ لاشیں ضرور موجود تھیں۔ اور کہیں ایسا بھی تھا کہ ان لاشوں کے لیے نوحہ خواں بھی کوئی نہ بچا۔

امدادی کاموں کی ٹیم مصروف بہ کار تھی۔ پھنسی ہوئی اور کچلی ہوئی لاشوں کو ملبے سے باہر کھینچنا بڑا تکلیف دہ کام تھا۔ تعفن کی وجہ ٹھہرا بھی نہ جاتا تھا۔ بجلی کے تار زمین پر بکھرے پڑے تھے۔ ہر چیز کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا، خوفناک سائے رک رک کر چمکتی بجلیاں جیسے کسی دم توڑتے

مریض کی آخری ہچکیاں ہوں۔ ریلیف کیمپ کے پاس ستم زدہ عورتوں بچوں اور بوڑھوں کا ہجوم تھا۔ جو زندگی کی اہم ضرورت روٹی، کپڑا اور مکان کے لیے دامن پسارے ہوئے تھے

ان سب سے الگ ایک بڑھیا تھی جو سب کے لیے سوالیہ نشان بن گئی تھی۔ ایک بڑے سے ملبے کے ڈھیر کو کریدتی ہوئی منھ ہی منھ کچھ بڑبڑاتی جا رہی تھی۔

میری عمر بھر کی پونجی یہاں ہے —— کوئی میری مدد کرو، میری صندوقچی نکال دو۔ اس میں میرا سارا دھن ہے —— امدادی ٹیمیں بڑھیا سے سوال کرتی رہیں مگر سوائے دھن دولت کے وہ کچھ بھی نہ کہتی۔ سب کو پتہ تھا کہ جب زندگیاں مٹ گئی تو پھر سرمایہ کہاں بچے گا۔ بڑھیا شاید پاگل ہو گئی تھی۔

عجب رنگ ہے لیل و نہار کے۔ جو بہار کا پہلا پھول تھے۔ وہ تو کمھلا گئے۔ جو خزاں رسیدہ زرد پتے تھے۔ ابھی وہ ڈال پر لرز رہے تھے۔ نہ زندگی نہ موت جانے کون سے عالم میں تھے۔

بڑھیا کی دیوانگی کا یہ حال تھا کہ ملبے کو کریدتے کریدتے جب تھک جاتی تو اسی مٹی کی گود میں سو جاتی۔ چند لوگوں نے یہ ضرور اندازہ لگا لیا تھا کہ شاید بڑھیا کے پاس جو اثاثہ تھا اسے زمین نے نگل لیا اور اسی بنا پر وہ پاگل ہو گئی ہے۔ پھر سب نے یہ بھی خیال کیا کہ بھلا اس کنگال بڑھیا کے پاس کون سی ہفت اقلیم کی دولت ہو سکتی تھی۔ جس کے لیے وہ اس قدر سرگرداں ہے۔ مگر یہ بھی غلط نہیں کہ بھکاری بھی سود کا کاروبار کرتے ہیں۔ کچھ ہی دن پہلے درگاہ میں جب ایک بھکارن کی موت ہو گئی تو تحقیقات پر پتہ چلا کہ اس کے سرہانے والے تکیے میں پانچ پانچ سو کے نوٹ جنھیں بڑے سلیقے سے پھٹے پرانے

کپڑوں میں لپیٹ کر روئی کی طرح تکیے میں بھرا گیا تھا۔ دستیاب ہوئے —— پیسا چیز ہی ایسی ہے انسان جس کے آگے کمزور پڑ جاتا ہے۔

ان ہی دنوں منسٹر صاحب کا دورہ بھی ہوا جو ہاتھ جوڑ جوڑ کر سر کو جنبش دے کر آنکھوں میں گلیسرین کے آنسو لا کر ایک منجھے ہوئے اداکار کی طرح ہر مصیبت زدگان کے پاس تسلی دینے آئے اور پھر بطور مدد کے وعدے بھی کئے جا رہے ہیں۔

یہ وعدے بھی بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ کئی رنگوں میں اس کے جلوے ہیں۔ انسان کو زندہ بھی رکھتے ہیں اور کبھی موت سے ہمکنار بھی کر دیتے ہیں —— دوستوں کے وعدے تسلی دیتے ہیں، لیڈروں کے وعدے جھوٹے خواب دکھاتے ہیں۔ دشمنوں کے وعدے تباہ کرتے ہیں۔ جھوٹے وعدے منجدھار میں رکھتے ہیں جہیز کے وعدے جھلساتے ہیں۔ وفا کے وعدے زندگی دیتے ہیں — اور لوٹے وعدے موت۔

دیپک اور انوار ان شریف انسانوں میں سے تھے۔ جو امدادی ٹیموں کے ساتھ محض اس لئے چلے آئے کہ تلاشِ معاش کر لیں۔ سارا دن مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرتے اور رات کو ملبوں کے ڈھیروں میں تلاشی مالِ غنیمت کی —— یہ ضروری بھی تو تھا اگر انھیں نہ ملتا تو اسے بھی مٹی ہی کھا لیتی۔ کسی کی موت سے کوئی تو مستفید ہو۔ —— دیکھا تو یہی گیا ہے کہ مرنے والے کے چھوڑے ہوئے مال و متاع پر اقربا کی نظر بڑی گہری ہوتی ہے اور اس دولت کو سٹورنے کے طریقے بھی دلچسپ ہوتے ہیں۔ یہاں تو دیپک اور انور مدد کے لیے آئے تھے یہ اور بات تھی کہ انھیں سرِراہ کچھ مل جاتا تو وہ ان کا اپنا ہوتا۔ ویسے منگل سوتر، ہاتھوں کے کڑے، کانوں کے جھمکے، پاؤں کے پازیب

دستی گھڑیاں، لوٹوں کی میلی گڈیاں وغیرہ - ان کا اثاثہ بن چکی تھی۔ بے روزگاری سے تنگ آکر اچھا قدم اٹھالیا تھا۔ انھوں نے ـــــــــ ہاں اس بات کا بھی انھیں شدید احساس تھا کہ بے چارے مرنے والوں نے زندہ لوگوں کی بڑی مدد کردی۔

دونوں نے جب بڑھیا کو دیکھا تو قسم کھائی کے اس کی دولت ضرور نکالیں گے۔ کیوں کہ یہ بات طئے شدہ تھی کہ صندوقچی سے نکلا ہوا مال آدھا آدھا بانٹ لیا جائے گا ـــــــــ بڑی تندہی کے ساتھ انھوں نے ملبہ صاف کرنا شروع کیا جب تھک جاتے تو بڑھیا بڑے پیار سے ان کا سر سہلاتی۔ ریلیف کیمپ سے ان کے لیے کھانا لے آتی سارا دن تو گزر جاتا۔ مگر شام کے سائے دراز ہوتے ہی خوفناک اُداسی پھیل جاتی۔ سڑی ہوئی لاشوں کی بدبو، ٹوٹی عمارتوں کے ملبے اندھیرے میں رینگتے سایے، سسکیوں اور آہوں کی بازگشت، زخمیوں کی کراہیں قطار در قطار جلتی ہوئی چتائیں۔ ـــــــــ یوں لگتا تھا جیسے شہرِ خموشاں میں چراغاں ہوں۔

متواتر دو دن اور دو رات کی تھکن سے چور دیپک اور انور نے طئے کر لیا کہ آج وہ اپنا مقصد پورا کر کے ہی رہیں گے۔ اینٹ، پتھر اور مٹی کا بڑا حصہ نکل چکا تھا اور ملبہ ایک گڑھے میں بدل گیا۔ وہ زندہ انسان مردہ مکینوں کے گھر اترے خوف ضرور مسلط تھا مگر آس بڑی چیز ہے۔ اندھیرے میں ٹٹو لتے ہوئے کوئی چیز ان کے ہاتھ لگ گئی۔ سچ مچ یہ ایک صندوق تھا۔ دونوں نے جھپٹ کر اٹھایا۔ اور اوپر لے آئے۔ صندوق کو دیکھتے ہی بڑھیا نے اسے دونوں سے چھین لیا۔ اور بے تحاشہ اسے سینے سے لگا لیا۔ اس کی کمزور آنکھوں سے لاتعداد آنسو بہہ نکلے۔ دفعتاً دیپک اور انور کے دل میں خیال آیا کہیں ایسا

نہ ہو بڑھیا صندوق لے کر چمپت ہو جائے اور ان کی ساری محنت اکارت جائے۔ ایک جھٹکے سے دونوں نے بڑھیا کے ہاتھ سے صندوق چھینا۔ اس پر پڑے چھوٹے سے تالے کو پتھر مار کر توڑ دیا اور جیسے ہی صندوق کھلا بڑھیا سامان پر گر پڑی۔ دیپک نے بڑھیا کو پرے دھکیل دیا اور سامان کی تلاش لینی شروع کی ——— مگر ——— مگر اس میں ایک قمیص جس پر خون کے بڑے بڑے دھبے تھے، ایک پتلون جو جابجا پھٹا ہوا تھا۔ ایک چھوٹی سی منی پرس جس میں رکھا پانچ کا نوٹ اپنی خستگی کا شکوہ کر رہا تھا۔ ایک کنگھی ایک عدد جوتا جس کا تلا پھٹا ہوا تھا اور ایک نوجوان کی تصویر جس کے چہرے پر فرشتوں جیسی مسکراہٹ تھی اس کے علاوہ اور کچھ نہیں

"اسی کے لیے تو نے ہمیں پریشان کیا بڑھیا ———" دونوں نے سامان اس کے منھ پر پھینک دیا۔ بڑھیا نے سامان سمیٹ لیا اور اس تصویر کو لے کر سینے سے لگا لیا۔ کبھی وہ اسے چومتی کبھی بلائیں لیتی اور کبھی آنکھوں سے لگا لیتی۔ دونوں اس کا بغور مطالعہ کر رہے تھے ——— آخرکار انور نے پوچھا۔

"تو نے تو دھن دولت کی بات کی تھی ———"

دیپک نے بھی سوال کیا۔

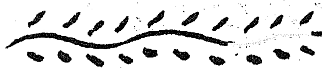
"تو نے تو کہا تھا تیری کل پونجی اسی میں ہے۔"

"ہاں ——— ہاں ———" بڑھیا نے چیخ کر کہا۔ "میری کل پونجی یہی ہے۔ دیکھو ——— دیکھو اس تصویر کو یہ میری عمر بھر کی کمائی ہے میرے من کا چین ہے، میری آنکھوں کی ٹھنڈک میرا بیٹا ——— ہاں میرا بیٹا۔ میرا دھن ہے یہ ———" وہ رو پڑی۔

"وہ رہا نہیں بس اس کی یہ تصویر ہی رہ گئی"

"کیا ہوا تھا اُسے ——" دیپک اور انور نے یک وقت سوال کیا۔

"چار سال پہلے کبھی ایسا ہی بھونچال آیا تھا —— مگر زمین پر نہیں دلوں پر —— جانے کون تھے وہ درندے جنھوں نے آگ لگائی گھر اُجاڑے عزت لوٹی، قبریں کھودیں، چتائیں جلائیں۔ میرا معصوم بچہ بھی فساد کی بھینٹ چڑھ گیا۔ جانتے ہو بیٹا دھرتی کب پھٹتی ہے، بھونچال کب آتا ہے۔ جب کسی ماں کے سامنے اس کی اولاد کا خون بہنے لگتا ہے۔ ماں بھی دھرتی کی طرح ہوتی ہے اس کی کوکھ سے کونپل پھوٹتا ہے۔ پروان چڑھتا ہے، پھل پھول دیتا ہے اس کی جڑیں دور تک زمین میں پھیل جاتی ہیں۔ بڑے بڑے درخت کاٹے جاتے ہیں اکھاڑے جا سکتے ہیں مگر ان کی جڑیں دھرتی میں اتنی مضبوطی سے بندھ جاتی ہیں کہ اسے کوئی نہیں کھینچ سکتا۔ وفاداری کی اس سے بڑھ کر مثال اور کیا ہو سکتی ہے —— لیکن جب ایسے کئی درخت کٹنے لگتے ہیں اور صرف جڑیں ہی باقی رہ جاتی ہیں تب ماں کی چھاتی پھٹ جاتی ہے اور لوگ اسے بھونچال کہتے ہیں۔ سچ تو ہے بیٹا یہی دھرتی کا دکھ ہے ——!!



اشکِ سنگ

سنگتراش نے طے کیا کہ وہ قدرت کا سارا حسن سمیٹ کر پتھر میں بھر دے گا۔ قوس و قزح سے رنگت، آفتاب سے تمازت، ماہتاب سے ٹھنڈک، گُلوں سے خوشبو، غنچوں سے شادابی، فلک سے فکر، نظاروں سے نظر، بجلی سے شرر، ستاروں سے ضیا، کلیوں سے حیا، پروانے سے وفا، بلبل سے ادا اور ——— اور انسان سے چاہ - - - - - ———

اشکِ سنگ

سنگتراش بڑی دیر سے سنگلاخ چٹانوں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ اس کے کاندھے پر ایک تھیلا لٹکا ہوا تھا جس میں چھینی اور ہتھوڑے کے علاوہ کچھ خوردونوش کا سامان تھرموس اور سگریٹ بھی موجود تھے۔ وہ بڑی دیر سے ایسے پتھر کی تلاش میں تھا جو تراشے جانے کے بعد پتھریلی خصوصیات کا حامل نہ رہے۔ بلکہ ایسے موم بن جائے کہ نظروں کی گہرائی اور گیرائی سے بھی پگھل پڑے۔

وہ ایسا مجسمہ بنانا چاہتا تھا کہ لوگ حقیقت کا فریب کھائیں۔ جو اس کی زندگی کا شاہکار ہو۔ وہ اپنے فن کا مکمل مظاہرہ کرنا چاہتا تھا۔ ایک ایسا بت تراشنا چاہتا تھا جس کے سینے میں دل دھڑکے۔ جو ہر نگاہ کو محوِ حیرت بنا دے۔

بے شمار جذبات سے بھرپور سنگتراش کا دل مختلف کیفیتوں سے دوچار تھا اور وہ یہ ساری کیفیت اس مجسمہ میں سمو دینا چاہتا تھا۔ اس کا دل معصوم اور ذہن پاکیزہ تھا۔ نہ عیاری نہ مکاری۔ نہ ڈھونگ نہ ڈھکوسلہ سچائی اس کا مسلک تھا۔ محبت چاہت پیار وفا۔ خلوص، لگن، تپش، کسک اور بے قراری نہ جانے کیا کیا اس کے زادِ راہ تھے۔ وہ تو پتھر کے سینے

میں دل دھڑکانا چاہتا تھا۔ اپنے رگ رگ میں کھلے زخموں کے گلابوں کی مہک اپنی نس نس میں بسے آہوں کا دھواں وہ پتھر کے اندر محسوس کرنا چاہتا تھا۔ وہ خود سراپا عشق تھا اور یہی شعلہ وہ پتھر میں بھڑکانا چاہتا تھا۔ اس نے بچپن میں پتھر سے آگ کو نکلتے دیکھا تھا اسے یقین ہو گیا تھا کہ آگ کا مسکن پتھر ہی ہے۔ مگر شعور کی منزلوں کو طے کرتے ہوئے کبھی کسی پتھر کو آگ برساتے نہیں دیکھا۔

کئی پتھروں میں نقش و نگار ابھارنے کے بعد سنگتراش نے طے کرلیا کہ وہ اب ایک ایسا مجسمہ بنائے گا جو زبانِ خاموشی میں گویائی رکھتا ہو۔ وہ زمانے کو ثابت کرنا چاہتا تھا کہ پتھر بھی بولتے ہیں۔ پتھر بھی ہنستے ہیں۔ پتھر بھی روتے ہیں۔ پتھر بھی دل رکھتے ہیں۔ اور پھر تلاش کا سلسلہ جاری ہوا۔

دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدلے۔ سنگتراش کی تلاش جاری تھی۔ پتھروں کے درمیان وہ اپنے موم جیسے وجود کو لیے گھومتا رہا۔۔۔۔۔۔۔ گھومتا رہا۔۔۔۔۔۔

آخر کار اُسے وہ پتھر مل ہی گیا جو اس کے خوابوں کو تعبیر دے سکتا تھا۔ اس نے تعمیر کا سفر شروع کیا۔ ترتیب و تزئین کا آغاز کیا۔

پتھر پر ہتھوڑے کی پہلی چوٹ نے طبل جنگ کی طرح جہد مسلسل کا آغاز کیا ضرب لگتی رہی، پتھر کھوتا رہا، موسم بیتتے رہے، رُت بدلتی رہی۔ سنگتراش کے مزاج میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہی جذبہ صادق تھا۔ وہی عمل پیہم، وہی سعئ مستقل، وہی مرحلۂ شوق اور وہی لگن ــــــ

ایک ماہ گزرا۔ پتھر ہموار ہو چکا تھا اب نقش و نگار کے آغاز کا مرحلہ

تھا۔ سنگتراش نے سوچنا شروع کیا مجسمے کا انداز کیا ہوگا۔ مختلف زاویئے نگاہوں میں آگئے۔ تخیل آفاق میں گھومنے لگا۔ کبھی شفق میں ڈوبی صبح اس کے سامنے آئی تو کبھی شبنمی دوپہر کبھی سلگتی شام تو کبھی طوفانی رات، کبھی بھیگے ہوئے ہوا کے جھونکے تو کبھی سرد راتوں کی خاموشیاں، کبھی جوشِ جنون تو کبھی نالۂ شوق۔ کبھی ملکوتی مسکراہٹ تو کبھی شبنم کے آنسو۔

سنگتراش نے طے کرلیا کہ وہ قدرت کا سارا حسن سمیٹ کر پتھر میں بھر دے گا۔ قوسِ و قزح سے رنگت، آفتاب سے تمازت، ماہتاب سے ٹھنڈک، گلوں سے خوشبو، غنچوں سے شادابی، فلک سے فکر، نظاروں سے نظر، بجلی سے شرر، ستاروں سے ضیار، کلیوں سے حیا، پروانے سے وفا، بلبل سے ادا ——— اور ۔۔۔۔۔۔۔۔ اور انسان سے چاہ ——— سب کچھ جیسے اس کے ہاتھوں میں سمٹ کر آگئے۔

وہ ان بے شمار جذبوں کو روپ دینا چاہتا تھا۔ پیہم ضرب لگتی رہی۔ بیابانوں میں دور دور تک چٹخنے کی صدا آتی رہی۔ اسے نہ بھوک تھی نہ پیاس نہ کھانے کا شوق نہ جینے کا ہوش۔ صرف جستجو، صرف آرزو، صرف خواہش، صرف تمنا ——— صرف لگن، صرف عمل اور صرف محویت ———

پتھر پیکر میں ڈھل گیا۔ آنکھوں میں حیا، لبوں پر تبسم، گالوں میں کھنور، انگلیوں میں نزاکت، قدموں میں قیامت، معصومیت ایسی کہ فرشتے شرما جائیں۔ بھولا پن اتنا کہ بچپن حیران رہ جائے۔ ادا ایسی کہ شباب کو شباب آجائے۔

ان سب کے باوجود سنگتراش مطمئن نہ تھا۔ سانسوں کی بازگشت میں خاموشی تسلیاں اس کے ہجومِ شوق کو روک نہ سکیں۔

وہ محسوس کر رہا تھا کہ ابھی بہت کچھ باقی ہے۔ کہیں کوئی کمی ضرور ہے۔ شاید مجسمہ جذبات سے عاری تھا۔ سنگتراش تو پیکر درد وفا تھا بھلا وہ کیسے گوارہ کرلیتا کہ اس کی تخلیق میں کائنات کی وہ آفاقیت جو لفظ محبت سے منسوب ہے سمٹ کر نہ آجائے سنگ بت تو بن گیا مگر اس کے سینے میں دل ـــــ جو وسعت کائنات کا مظہر ہے دھڑک نہ سکا۔

وہ جھلاہٹ میں آگیا ـــــ اس کے سارے وجود میں انگارے سے بھر گئے۔ کیا میں شاہکار نہ بنا سکا۔ حسن وجمال کا مرقع تو بن گیا مگر ـــــ مگر وہ چشم ہی کیا جو نم نہ ہو، وہ زلف ہی کیا جو برہم نہ ہو، وہ لب ہی کیا جو متبسم نہ ہو، وہ ابرو ہی کیا جو خم نہ ہو، وہ دل ہی کیا جو پر خون نہ ہو ـــــ

کتنے ارمانوں سے اس نے تراشا تھا اسے۔ اس سنگ کو تو وہ صنم بنانا چاہتا تھا۔ اپنے دل میں اسے بٹھا کر آرتی اتارنا چاہتا تھا۔ اس کے چاروں طرف وہ ہی تو تھا۔ آٹھ ماہ کی طویل کوشش کے بعد جب اس نے اپنے فن پر نظر ڈالی تو وہ فن پارہ نہ بن سکا۔ صرف ایک بت بن گیا جذبوں سے خالی ـــــ حالاں کہ اسے تراشتے ہوئے جذبات کی پوری شدت اس کے ہاتھوں میں سمٹ آئی تھی۔ اتنی ریاضتوں کے بعد وہ ادھورا کیوں ہے۔ وہ اندر ہی اندر اپنے ہی بنائے بت کو پوجنے لگا ـــــ بت گر بت پرست بن گیا۔ مگر سنگ موم نہ بن سکا۔ کوئی سوتا نہ پھوٹا اس سے کوئی قطرہ اشک نہ نکلا ـــــ

"شاید میری محنت میں کوئی کمی رہ گئی ہے ـــــ؟ ایک سوالیہ نشان سنگتراش کے ذہن میں ابھرا۔

"میں نے تو اپنی ساری توانائی لٹادی۔ سارے جذبوں کو نچھاور کردیا۔" اس کے دل نے کہا تو پھر یہ ادھورا پن کیوں ——؟" اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ جواب میں دور تک خاموشی کی چیخ سنائی دی۔ اس نے اپنے اطراف نگاہ دوڑائی پتھروں کے بیچ وہ اکیلا تھا۔ بالکل اکیلا۔ تنہائی کی شدت سے گھبرا کر وہ صرف سر پھوڑ سکتا تھا۔ کاش اس نے بت نہ بنایا ہوتا۔ دل میں ناسور تو نہ ہوتا۔ شاہکار بنانے کی آرزو اسے کن کن منزلوں سے گزار رہی تھی۔

لوگوں نے اسے دیوانہ بھی کہا اس کی ہنسی بھی اڑائی۔ اس پر اظہار تاسف بھی کیا۔ مگر وہ ان سب باتوں سے بالاتر تھا۔ اب صرف ایک ہی رات باقی تھی۔ نمائش میں اسے اپنے فن کو پیش کرنا تھا۔ صرف ایک رات۔ ۱۲ گھنٹے —— جس میں سسکتے لمحے تھے اور بھیانک خاموشیاں۔

اُداسی —— گہری اُداسی اُس کے حواس پر چھا گئی۔ شاید تشنہ کامی اس کا مقدر ہو شاید اس کی کاوشیں ناکام ہوں اس نے ایک بار اس مجسمہ پر گہری نظر ڈالی۔ دلکش قد و قامت، حسین نقش و نگار —— وہ دیکھتا رہا —— دیکھتا رہا۔ شاید اس کا وجود پتھر میں ڈھلنے لگا اس کے سارے جذبے ساکت ہونے لگے۔ زمین نے قدم جکڑ لیے۔ آنکھوں میں نمی تیرنے لگی بال کچھ اور بکھر گئے۔ جبیں شکن آلود ہو گئی اور دل پر قنوطیت ——

دور کسی ویرانے میں کوئی پرندہ پھڑپھڑاتا نکل گیا۔ وہ خیالوں کے جنگل سے آزاد ہو گیا

"شاید تراشنے میں مجھ سے ہی بھول ہو گئی ——" اس کے لب ہلے اور دفعتاً "کھٹاک" کی آواز سے ماحول دہل گیا۔ سنگتراش

نے خود اپنے ہاتھ پر ہتھوڑے کی پہلی ضرب لگائی۔ اور پھر سناٹوں میں ہتھوڑے کی ضرب سنائی دیتی رہی۔ سنگتراش کی سرگوشیاں خاموشی کو توڑ رہی تھیں۔

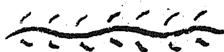
"اب یہ ہاتھ کوئی بت نہیں تراشیں گے۔ میرے احساس نے مجھے دھوکہ دیا۔ میں خود فریبی کے جال میں پھنس گیا میرا جنون سنگ کو موم بنانا چاہتا تھا ـــــ مگر سنگ تو سنگ ہی ہوتا ہے"......

مجسمہ بدستور اپنی جگہ ساکت تھا ہتھوڑے کی ضرب جاری تھی ....ـــ...

صبح کی پہلی کرن ہر روز کی طرح ایک نیا پیغام لیے زمین پر اتر آئی۔ لوگوں نے دیکھا مجسمے کے قدموں میں سنگتراش کا سر تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ کچلے ہوئے تھے ان میں سے خون دھیرے دھیرے رس رہا تھا۔ ہتھوڑے پر خون کے دھبے اب بھی تازہ تھے۔

ہاں ایک انوکھی بات ضرور سب نے دیکھی۔ مجسمے کی آنکھ سے پانی ٹپک رہا تھا۔ یہ کہاں سے ابل پڑا ـــــ؟ کسی کو دکھائی نہ دیا ـــ شاید بت کے سینے میں دل دھڑکنے لگا تھا اس لیے اشک سنگ بہہ نکلے۔

اور پھر یہی مجسمہ نمائش میں شاہکار قرار دیا گیا ـــــ



جائے پناہ

گلی کے سارے دروازے بند تھے لگتا تھا شہر کا شہر خالی ہو گیا۔ کیا گھروں کے ساتھ دلوں کے دروازے بھی بند کر لیے دنیا والوں نے ——— !!

موت کا خیال کتنا آسان ہے اور موت کا سامنا کتنا مشکل۔ وہ لرز گیا۔ دور کہیں زندگی مسکرا رہی تھی۔ اس کا دل اچھلنے لگا۔ جی چاہا لپک کر اُسے چھو لے ——— مگر شاید وہ اس کی پہنچ سے دور ——— دور ہو رہی تھی۔

جائے پناہ

وہ رو رہا تھا۔ اُس کے اُجلے آنسو میلے دامن میں جذب ہو رہے تھے۔ تاریکی کے سیاہ پردے کو چاک کرتی صرف پولیس کے جوانوں کے جوتوں کی آواز تھی کہیں دور کسی کتے کی رونے کی آواز گونجتی اور پھر ہولناک سی اُداس خاموشی پھیل جاتی۔ وہ اندر ہی اندر سسک کر رو رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ دھاڑیں مار کر رو دے مگر آواز اس کے حلق تک آکر تھم جاتی اس کے سینے میں عجیب سی گھٹن تھی۔ خوف کے سائے اس کے چہرے پر منڈلا رہے تھے۔ آنکھیں جیسے ویرانوں میں گمشدہ چیزوں کی متلاشی تھیں۔ مارے دہشت کے اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ قدم منوں وزنی ہو گئے۔ بھوک اور پیاس نے بھی نڈھال کر رکھا تھا اس کی سہمی ہوئی آنکھوں میں وہی جان سوز منظر تھا جب اس کی ماں کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا گیا اور اس کے باپ کے سر پر کلہاڑی سے مارا گیا تھا۔ وہ اگر چھپ نہ جاتا تو شاید ایسے ہی کٹ جاتا۔ دن دھاڑے خون کی یہ ہولی کھیلی گئی۔ کوئی مدد کو نہ آ سکا۔ سبھی اپنے گھروں کے دروازے بند کیے صرف آوازیں ہی سنتے رہے۔ بیدردوں نے جو کچھ لوٹنا تھا سمیٹ لیا وہ تو اچھا ہوا کہ اس نے خود کو حمام میں بند کر لیا اور ان کی نظر نہ پڑی ورنہ ۔۔۔۔۔

اس بھیانک خیال سے ہی اس کا وجود کانپ گیا۔ اپنی آنکھوں سے زندگی کی دولت لٹنے کا تماشہ چھپ کر دیکھتا رہا۔ ماں اور باپ کی خون میں تر بتر لاشیں اس کے سامنے

تھیں اور وہ رو رہا تھا۔ دن ڈھلے پولیس آئی لاشوں کو ایمبولنس میں ڈالا اور ہسپتال کی راہ لی۔ چند جوانوں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈ پڑا تھا اُسے اُٹھایا اور ایک ہینڈ بیگ جس میں اس کے ابا نے اپنے دوست سے منگوائے جاپانی کھلونے رکھے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا گویا کہہ رہے ہوں چلو کچھ تو ملا ورنہ صرف خون ہی دیکھنے کو ملتا

شام ڈوبنے کو آئی اندھیرے کی سیاہی گہری ہوئی تو وہ چھپتے چھپاتے باہر نکلا۔ چاروں طرف بھیانک خاموشی تھی لگتا تھا شہر، شہر خموشاں بن گیا ہو۔ وہ جائے پناہ کی تلاش میں تھا ـــــــ کہاں جائے ـــــــ کس کے گھر جائے ـــــــ کہاں اماں ملے گی اُسے ؟

اس کا معصوم ذہن ان سوالوں کا جواب تو نہ دے سکا مگر اُس کے قدم چل پڑے چلتے چلتے اُسے ماں کے الفاظ یاد آئے "خدا سب کا نگہبان ہے۔" اور پھر اُس کی نظر ایک عبادت گاہ کے بلند میناروں پر پڑی۔ اس کا دل خوشی سے دھڑکا۔ خدا یہاں ضرور ہوگا ـــــــ اس نے آستین سے آنسو پونچھے اور سہمے قدموں، خوف زدہ آنکھوں سے اندر داخل ہوا۔ اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر سرگوشیوں کی آواز اُس نے سن لی۔

کام ہوشیاری سے ہونا چاہیے۔

فکر مت کرو۔ یہی تو موقع ہے بدلہ لینے کا۔ حالات ہمارا ساتھ دیں گے۔

وہ ایک کھمبے کی آڑ میں چھپ گیا۔ پہلے تو یہ باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آئیں مگر پھر اس نے جان لیا کہ یہاں بھی خون خرابے کا ذکر ہے۔ کیا خدا روٹھ کر کہیں چلا گیا ـــــــ نہیں تو نہیں تو بھلا ایسے لوگ یہاں کیوں چھپے ہوتے ـــــــ ؟

"آج رات ہی یہ کام ہو جانا چاہیے۔"

"مگر اپنے بچاؤ کے لیے بھی تو ...... "

اس کی فکر نہ کرو۔ ہم نے کافی ذخیرہ جمع کر لیا ہے۔ ایک بات کا خیال رکھنا جو بھی آئے چاہے بچہ ہو یا بوڑھا بس خلاص کر دینا ——"

"ٹھیک ہے مگر کہیں پکڑا گیا تو ——

ارے یار کیوں سوچتے ہو۔ چٹکی بجاتے میں ضمانت ہو جائے گی۔ تمہیں تو ہم نے خاص طور سے بلایا ہے۔

ہاں —— وہ تو ٹھیک ہے مگر اپنا بندوبست بھی تو کر لینا ہے۔

سمجھو کہ ہو گیا۔ بس اب دیر نہ کرو۔ جگہ ہم بتا دیں گے باقی تم سنبھال لینا۔"

ان سرگوشیوں کے بعد کئی قدموں کی ملی جلی آوازیں آنے لگیں وہ دیوار کی طرف چھپ گیا۔ وہ خود کو ان کی نظروں سے پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا کیوں کہ اسے یہاں بھی وہی درندگی کی باتیں سنائی دیں جو اس نے اپنے گھر میں سنی تھیں۔ ان لوگوں کے باہر نکلتے ہی وہ بھی باہر چلا آیا "نہیں —— میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ کیا پتہ میرا کیا حشر ہو —— یہ بھی میرے لیے جائے پناہ نہیں ——" وہ سسک کر رہ گیا۔

گہری خاموشی، پر اسرار اندھیرا اس کا ننھا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ پھر سڑک پر آچکا تھا۔ بھوک الگ بے چین کر رہی تھی خوف اس کے ساتھ سایے کی طرح لگا تھا۔ پولیس کے جوانوں کے بھاری جوتوں کی آواز سے وہ دہل رہا تھا۔ سڑک سے ہٹ کر وہ ایک تاریک گلی میں آگیا۔ گلی کے سارے دروازے بند تھے لگتا تھا شہر کا شہر خالی ہو گیا ہو۔ کیا گھروں کے ساتھ دلوں کے دروازے بھی بند کر لیے دنیا والوں نے ——؟ ایک سوال ابھرا اور پھر اسے رونا آگیا۔ وہ دھیرے دھیرے سسکیاں بھرتا ایک مکان کے چبوترے پر بیٹھ گیا۔ چند ہی لمحوں بعد دروازہ کھلا اس کی امیدیں جاگیں۔

"اے چل اُٹھ یہاں سے ——" کسی نے کہا۔

"مجھے بھوک لگی ہے ——" اس کے الفاظ ٹوٹ رہے تھے۔

"جاتا ہے کہ نہیں ـــــــ اس بار اس نے دھتہ کار دی، شاید انسانیت کا جنازہ بھی نکل رہا تھا۔ کتنی چھوٹی ہے یہ دنیا ـــــــ اس کے ذہن نے سوچا۔

اور پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ آگے چل کر اس کی نظر ایک اور عبادت گاہ پر پڑی۔ دل کی ڈھارس بندھی۔

شاید اس جگہ میں دم لے سکوں ـــــــ ہو سکتا ہے خدا یہاں چھپا بیٹھا ہو۔ اور اگر وہ ہوگا تو ضرور مجھے پناہ دے گا۔ اس کے معصوم ذہن کو امید کا سہارا ملا۔ وہ اس جانب بڑھا مگر وہاں ـــــــ وہاں تو پولیس کے جوان کھڑے تھے بندوقیں لیے۔ اور نہ جانے کیوں وہ ان خونخوار انسانوں سے زیادہ پولیس والوں سے ڈرتا تھا۔ اسے یاد تھا ایک دن بلا وجہ اس کے پڑوسی کے لڑکے کو کسی کی شکایت پر کتنی بری طرح پیٹا تھا انھوں نے اور پھر جیل میں ڈال دیا۔ دو دن بعد بے چارے کی لاش ہی گھر کو آئی۔ اس واقعہ کے ذہن میں آتے ہی اسے جھرجھری آگئی۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کرے۔

تبھی عبادت گاہ کے اندر سے چند نوجوانوں کا جتھہ نکل آیا۔ جو اپنے چہروں کو کپڑے سے لپیٹے ہوئے تھا۔

"کام ہوشیاری سے کرنا ـــــــ"، پولیس کے ایک جوان نے ہدایت دی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا

"تم چنتا مت کرو۔ بس یوں گئے اور یوں آئے۔ ماچس کی صرف ایک تیلی ہی کا تو کام ہے۔

"دیر نہ لگانا ہماری نوکری کا معاملہ ہے۔"

"لو اسے ساتھ رکھ لو شاید کچھ کام آجائے۔" ایک کانسٹبل نے اپنی بندوق حوالے کر دی۔

"ٹھیک ہے ـــــــ اور پھر سب باہر نکل گئے۔ وہ اپنے وجود کو سمیٹ کر ایک کونے میں دب گیا۔

"آخر خدا کہاں کھو گیا ــــــ!"

"چپ ــــ خاموش رہ۔ کسی نے سن لیا تو۔" اس نے اپنے آپ کو ڈرا دیا۔

وہ اب تھک چکا تھا۔ اتنی بڑی دنیا میں اسے کہیں پناہ نہیں ــــ اب میں کہاں جاؤں۔ زندگی کے سارے راستے جیسے بند ہو گئے۔ بھوک کا احساس بھی مٹ گیا۔ اب صرف اور صرف پناہ چاہیے تھی۔

اس نے محسوس کیا جیسے وہ پتھر بن گیا ہو۔ سارا وجود بے حس و حرکت ہو گیا ہو۔ اب وہ اس بوجھ کو کہاں پھینک دے۔ دفعتاً جیسے بجلی سی کوندی مجھے بھی مرجانا چاہیے۔ اماں اور بابا کی طرح ــــ" وہ ایک عزم سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر اس نے سوچا اماں اور بابا مرنا تھوڑا ہی چاہتے تھے وہ تو ــــ وہ تو ان ظالموں نے ــــ پھر میں کیا کروں اور نہ جانے اس میں کیسے اتنی ہمت آگئی وہ سڑک کے بیچوں بیچ آ کھڑا ہوا۔ اس کے روبرو نئے پل کا راستہ تھا۔ اس نے طے کر لیا وہ ندی میں کود جائے گا۔ مگر کودنے کا خیال بھی بڑا خوفزدہ محسوس ہوا۔ پھر کیا کرے ــــ پولیس کی ویان کے نیچے آجائے۔ مگر تصور میں اس کے جسم پر کانٹے ابھر آئے۔ اب میں کیا کروں ــــ موت کا خیال کتنا آسان ہے اور موت کا سامنا کتنا مشکل ــــ وہ لرز گیا۔ دور کہیں زندگی مسکرا رہی تھی۔ اس کا دل اچھلنے لگا۔ جی چاہا لپک کر اسے چھو لے ــــ مگر شاید وہ اس کی پہنچ سے دور ــــ دور ہو رہی تھی۔ اب اس سے رہا نہ گیا۔ جی چاہا اتنا چلا کر روئے کہ آسمان شق ہو کر اسے نگل لے یا پھر زمین پھٹ کر اسے گود میں لے لے ــــ

وہ جانتا تھا کہ نہ آسمان شق ہوگا نہ زمین پھٹ سکے گی۔ سمنٹ کی بنی ہوئی تہہ جگہ جگہ سے اکھڑ تو سکتی ہے مگر پھٹ نہیں سکتی۔

اس نے ایک بار پھر اپنے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ دور کسی دوکان کے سائبان میں کسی گٹھڑی کی شکل میں کوئی لیٹا دکھائی دیا۔ بھوک پیاس تو مٹ چکی تھی مگر جانے

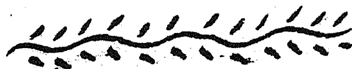
کیوں اُسے نیند کا احساس ہوا۔ آنکھیں جیسے جھپکنے لگیں۔ وہ سڑک سے ہٹ کر دوکان کے قریب آگیا اور اسی گٹھڑی سے لپٹ کر سوگیا۔

صبح کی پہلی کرن جب اس کے چہرے پر پڑی تو اس نے دیکھا وہ بڑے آرام سے چادر اوڑھے لیٹا ہے اور اس کا سر ایک پاگل بھکارن کی گود میں ہے جس کے چہرے پر ممتا کا تقدس پھیلا ہوا ہے اور جس کی مسکراہٹ زمانے کا لاز سمجھا رہی ہے۔ اس نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

"ارے ـــــ یہ تو کانتا موسی ہیں جسے لوگ پاگل سمجھ کر پتھر مارتے ہیں۔ ایک دن اس نے بھی تو یہ حرکت کی تھی تب اماں نے بتایا تھا کانتا موسی کا اکلوتا بچہ فسادات میں زندہ جلا دیا گیا تھا اور تب سے وہ پاگل ہوگئی تھیں۔ دفعتاً وہ لبستر سے اٹھ بیٹھا۔ اور کانتا موسی سے لپٹ گیا۔ گویا یہی اس کی منزل یہی جائے پناہ ہو۔ کچھ خوشی اور دکھ کے ملے جلے جذبات آنسو بن کر آنکھوں میں امڈ آئے۔

"بیٹا بھوک لگی ہے نا تجھے۔ لے یہ روٹی کھالے۔" کانتا موسی نے اپنی پھٹی ہوئی جھولی سے روٹی کا ایک ٹکڑا نکالا اور اسے توڑ کر اس کے منھ میں رکھ دیا ـــــ
تبھی اس کا معصوم ذہن بیدار ہوا ـــــ اس نے سوچا

کون کہتا ہے خدا کھو گیا ـــــ !! خدا ہے۔ خدا ہے۔ خدا ہے ـــــ"
اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔



نقش فریادی

"آخر کیوں رو رہے ہو تم ـــــ؟" میں نے اسے سہارا دے کر دوکان کے چبوترے پر بٹھا دیا۔

"کچھ تو بتاؤ ـــــ پچھلے ایک گھنٹے سے میں تمہارے ساتھ ہوں مگر تم نے اپنے منھ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا ـــ آخر بات کیا ہے۔ کیا تم گونگے ہو ـــــ؟۔"

"نہیں نہیں" وہ چیخ اٹھا ـــــ اسکے جھریوں بھرے گالوں پر آنسوؤں کا آبشار بہہ نکلا ـــــ میں گھبرا گیا۔

نقشِ فریادی

کامپلکس کی گیٹ پر بھیڑ لگی تھی۔ میں آٹو سے اتر کر قریب پہنچا۔ ایک ڈرائیور اور چوکیدار کے درمیان سخت کلامی کے ساتھ ساتھ ہاتھا پائی بھی ہو رہی تھی۔ لوگ محوِ تماشہ تھے۔ میں نے غور سے نظر ڈالی تو چوکیدار کی عمر ساٹھ ستر کے لگ بھگ تھی۔ کمر خمیدہ آنکھوں پر چشمہ چہرے پر جھریاں نحیف و ناتواں اس کے برعکس ڈرائیور نوجوان تنومند اور طاقتور۔ بھلا کیا مناسبت تھی جھگڑے کے لیے۔

جب میں نے دیکھا کہ چوکیدار منھ کے بل گر پڑا ہے تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں اس کے قریب پہنچا اور سہارا دے کر اسے اٹھایا۔

"تمہیں خیال آنا چاہیے ایک ضعیف آدمی پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے" میں نے مداخلت کی۔

"اے صاحب ـــــ اپنا راستہ لو خواہ مخواہ بیچ میں آنے کی کوشش نہ کرنا۔" وہ فخریہ انداز میں سینہ تانے آگے نکل گیا۔ میری اس پہل پر لوگوں میں کچھ ہل چل مچی۔ اور سبھی نے ڈرائیور کو برا بھلا کہنا شروع کیا۔

میں نے پانی منگوا کر اس کا منھ دھلوایا۔

"اس عمر میں تمہیں نوکری کی کیا ضرورت تھی ـــــــ" میں نے ازراہِ ہمدردی اس سے سوال کیا۔ وہ چپ رہا

"لوگوں سے خواہ مخواہ بحث بھی نہیں کرنی چاہیے۔ تم نے اپنی عمر کا لحاظ تو رکھ لیا ہوتا۔" وہ پھر بھی چپ رہا۔

"شاید تم نے صبح سے کھانا نہیں کھایا ـــــــ" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"ادھر ہوٹل چلیں ـــــــ" اس نے سہمی ہوئی نظروں سے کامپلکس کی جانب دیکھا۔

"ارے ـــــــ اس کی فکر مت کرو۔ میں بتا دوں گا ان لوگوں کو تمہیں چوٹ لگی تھی۔ اور تم ہسپتال گئے ہو"۔ اس کے چہرے پر ہلکا سا تبسم اُبھرا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم دونوں مل کر ہوٹل پہنچے۔

"کیا کھاؤ گے ـــــــ؟" میرے اس سوال پر وہ گردن جھکا کر بیٹھ گیا۔ میں نے پوری اور ساگ کا آرڈر دے دیا۔

"کتنے سال سے نوکری کرتے ہو ـــــــ؟" اس نے اشارے سے دو انگلیاں بتائیں۔

"دو سال سے ـــــــ" اس نے سر ہلایا۔

ایک ہلکی سی آہ اس کے لبوں سے نکلی۔

"کیا پیر میں تکلیف ہے ـــــــ؟" اس نے پھر گردن ہلا دی۔

"کیا ہوا ـــــــ؟ میرے اس سوال پر اس نے اپنا پتلون اُٹھا کر دکھایا گھٹنے کے پاس زخم کا نشان تھا اور سوجن بھی آ گئی تھی

"اوہ ـــــــ دوا نہیں لی" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"کما سکتے ہو تو خود کے لیے خرچ نہیں کر سکتے۔

وہ چپ رہا —— اتنے میں ویٹر نے ہمارے آگے پوری اور ساگ رکھ دیا۔

"لو کھاؤ" میں نے پلیٹ اس کے آگے بڑھائی۔

وہ کھاتا رہا —— اور میں اس کے چہرے کے کرب کو پڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ کھانے میں کچھ اس قدر مصروف تھا کہ ایک بار بھی اس نے میری طرف نظر نہیں اٹھائی۔ کھانا ختم ہونے کے بعد اس نے ویٹر کی طرف دیکھا میں سمجھ گیا۔ چائے کا آرڈر دے کر میں نے پھر اس سے پوچھا

"کتنی تنخواہ ملتی ہے ——؟" اس نے اپنی جیب سے ایک میلی سی دستی نکالی اور منھ صاف کرتے ہوئے اشارے سے تین انگلیاں بتائیں۔

"تین سو روپیے ——!" اس نے گردن ہلا دی۔

"کتنے لوگ ہیں گھر میں ——!" میں نے پھر ایک سوال کیا۔ اس نے خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے اپنا سوال دہرایا۔ اس نے انکار میں گردن ہلا دی۔

"تم اکیلے ہو —— اس سوال پر اس کی گردن جھک گئی۔

اس اثنا میں اس نے میری کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی اور اٹھ کھڑا ہوا ——

"شاید تمہیں دیر ہو رہی ہے اچھا چلو چلتے ہیں۔ میں نے کاؤنٹر پر بل ادا کیا اور ہوٹل سے باہر نکل گیا تبھی وہ میرے قدموں سے لپٹ گیا۔

"ارے رے......... یہ کیا کرتے ہو۔ میں پیچھے ہٹ گیا۔

اس کی گرفت میرے پیروں پر مضبوط ہو گئی میں نے سہارا دے کر اسے اٹھایا۔ اس نے میرے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ اور تشکرانہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

"بابا ــــــ انسان ہی تو انسان کے کام آتا ہے۔ میں نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

"آنسو انمول ہوتے ہیں انھیں اس طرح ضائع نہ کرو" وہ یکایک چھلک پڑا۔ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی معصوم بچہ اپنے کھلونے کو دوسرے کے ہاتھ میں دے کر بلک اٹھتا ہے۔

"آخر کیوں رو رہے ہو تم ــــ" میں نے اسے سہارا دے کر دوکان کے چبوترے پر بٹھا دیا ــــ وہ روتا رہا۔

"کچھ تو بتاؤ پچھلے ایک گھنٹے سے میں تمہارے ساتھ ہوں مگر تم نے اپنے منھ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا ــــ آخر بات کیا ہے ــــ کیا تم گونگے ہو ــــ؟

"نہیں نہیں ــــ وہ چیخ اٹھا۔ اس کے جھریوں بھرے گالوں پر آنسوؤں کا آبشار بہہ نکلا۔ میں گھبرا گیا۔

کہو بابا ــــ کیا بات ہے ــــ؟ بتاؤ مجھے شاید تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔ چلو میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آتا ہوں تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ میں نے اس کا بازو تھاما۔ آٹو رکشا کو آواز دی اسے سنبھال کر آٹو میں بٹھایا۔ کچھ دیر بعد اس کا مکان آگیا۔ سفالی مکان جس پر بوسیدہ پردہ لٹک رہا تھا۔ میں نے سہارا دے کر اسے اتارا وہ لنگڑاتا ہوا اندر داخل ہوا۔ تبھی ایک دھماکے کی طرح کسی کی آواز آئی۔

"کیوں آج نوکری پر نہیں گئے ــــ؟"

"صبح کھانا تیار نہیں تھا! بھوکے کیسے جاتے بیچارے ــــ

کسی خاتون کی آواز آئی۔ ان آوازوں کو سن کر میں نے آٹو رکشا کو رکنے کا حکم دیا۔

"یہ پیر کو کیا ہو گیا ——" کسی مرد کی آواز آئی۔

"لو اور دیکھو —— سونے پر سہاگہ پہلے ہی پریشانیاں کچھ کم نہیں اس پر ......" یہ خاتون کی گریہ وزاری تھی۔

"کیا ہو گیا —— کہاں گر گئے —— کس سے جھگڑا کیا ہزار بار کہا کہ عمر ہو گئی ہے بس نوکری کو جاؤ اور گھر آؤ —— مگر سمجھ میں نہیں آتا جانے کہاں کہاں گھومتے پھرتے ہو۔" نوجوان کا لہجہ تیز تھا۔

"اونہہ —— ایک اور آفت گلے پڑ گئی۔ مفلسی میں آٹا گیلا اب کرتے رہو اپنے باپ کا علاج ——" خاتون کی بے زار سی آواز آئی۔

"م .... میں .... میں ...." بوڑھے کی کمزور آواز سنائی دی۔

"میں تو تنگ آ گیا بابا تم سے۔ اب گھر میں رہو گے تو تنخواہ الگ کٹ جائے گی۔ کمانے والے دو ہاتھ اور کھانے والے دس —— یہ اسی نوجوان کی آواز تھی۔

"ٹھیک ہے میں نوکری کو جاتا ہوں ——" بوڑھے نے جواب میں کہا۔

"جاؤ —— بے کار گھر میں کیا کرو گے ہو سکے تو کچھ اڈوانس لے کر دوائی لے لو۔ ہاتھ پیر ساتھ نہ دیں گے تو کماؤ گے کیسے۔

کواٹر کا پردہ ہلا۔ بوڑھا لنگڑاتا ہوا باہر نکلا اس کی اور میری

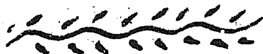
نظریں ملیں۔

"بیٹا مجھے کا ہیلکس تک چھوڑ دو ــــــ" اس نے التجا کی۔ میں نے اسے سہارا دے کر بٹھالیا۔ آٹو چل پڑا۔

"مگر بابا ــــــ تم کو تو آرام چاہیے۔" میں نے اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیا۔ جہاں زمانے کی ستم ظریفیاں کھلے انداز میں جلوہ گر تھیں۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"بیٹا ــــــ شاید تمہیں یہ نہیں معلوم کہ ریس کا گھوڑا کبھی جب لنگڑا ہو جاتا ہے تو اسے گولی مار دی جاتی ہے چاہے وہ کتنے ہی لاکھ کا کیوں نہ ہو ــــــ میں گولی نہیں کھانا چاہتا ــــــ"

کا ہیلکس آچکا تھا وہ لنگڑاتا ہوا اتر گیا۔ اس کے چہرے کا ہر نقش فریادی تھا۔ اور میں یہی سوچتا رہا نہ جانے ہر گلی ہر گھر میں ایسے کتنے نقش ہیں جو وقت کی گرد سے دھندلا کر فریاد کر رہے ہیں۔ کاش کوئی ان کی فریاد سن سکتا ــــــ کاش۔



دھماکہ

"یہ تمہاری پھیلی ہوئی بانہیں۔ تمہاری آنکھوں میں چمکتے محبت کے جگنو، تمہارے لبوں سے نکلتے شہد میں ڈوبے الفاظ، تمہارے سینے میں دھڑکتا دل میرا سنگھاسن ہے۔ یہی سب تو میری جنت ہے۔"

"تشدد درندگی کی ایک صفت ہے۔ تم ایک اچھے انسان ہو ملک۔ یہ حیوانگی کا لباس تمہیں کہاں سے مل گیا۔ اپنا ہی گھر جلاؤ گے تو پناہ کہاں پاؤ گے۔"

دھماکہ

لیلائے شب نے اپنا دامن پھیلا دیا تھا۔ تاروں کا بدن جگمگانے لگا۔
جنگل کی پُراسرار خاموشی میں جھینگروں کی صدائیں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔ سیاہ ناگ کی طرح بل کھاتی ہوئی ٹرین پوری تیز رفتاری کے ساتھ خرام سفر تھی۔ وہ تیسرے درجے کے کمپارٹمنٹ میں ننھے آشو کو لیے بیٹھی تھی۔ جس رفتار سے ٹرین چل رہی تھی اُسی رفتار سے اس کے دماغ میں بیتی باتوں کی فلم چل رہی تھی۔

"شالو ——— میں تمہیں زندگی کا وہ سکھ نہ دے سکا جسے جنت کہتے ہیں۔"
ملک نے ایک بار اس سے کہا تھا۔

"یہ تمہاری پھیلی ہوئی باہیں، تمہاری آنکھوں میں چمکتے محبت کے جگنو، تمہارے لبوں سے نکلتے شہد میں ڈوبے الفاظ، تمہارے سینے میں دھڑکتا دل میرا سنگھاسن ہے یہی سب تو میری جنت ہے۔"

"تخیل کی پرواز پر زندگی کا دار و مدار نہیں ہوتا شالو۔ ضروریات زندگی عین حقیقت ہیں"

"میرا خواب بھی تم ہو اور حقیقت بھی۔ اب رہی ضرورت وہ تمہاری ہے میری نہیں۔ میں نے تو فیصلہ کر لیا ہے" ایک عزم کامل کے ساتھ وہ آگے بیٹھ گئی۔

نظریات کے اس اختلاف کے باوجود محبت جیت گئی۔ وہ سب کچھ چھوڑ کر چلی آئی اپنے ملک کے پاس۔ ملک شہلا کی ضد کے آگے بے بس تھا اور خود اپنی چاہت سے مجبور بھی۔ انگریزی میں ایم اے کرنے کے باوجود کوئی اچھی نوکری نہ ملی گورنمنٹ کالج میں رشوت کا زور تھا اور خانگی ادارے سفارشات کے بل پر چلتے تھے۔ حالاں کہ وہ کیٹس یا ورڈس ورتھ کی نظمیں سمجھاتا۔ یا شکسپیئر کے ڈرامے۔ تو سارا ماحول طلسمی بن جاتا زبان اتنی شستہ اور روان جیسے بہتی گنگا کا دھارا۔ ایک ماہ کی مغز پاشی کے بعد صرف بارہ سو روپیے اس کی ہتھیلی پر ہوتے جو ضروریاتِ زندگی کے لیے کسی صورت بھی کافی نہ ہوتے۔

تب وہ شہلا کو احساس دلاتا۔ "دیکھ لیا نا خواب اور حقیقت میں کتنا فرق ہے۔"

"اتنا ہی جتنا تمہیں محسوس کرنے اور پانے میں ہے۔" وہ ایک ادا سے ناز سے کہتی۔

"شالو ــــــ اس ایک سال میں تمہیں میں نے کیا دیا۔ مصیبتیں، مایوسیاں محرومیاں، ــــــ نہ خوش پوش رکھ سکا نہ بہرہ ور کر سکا۔ مجھے کچھ کرنا ہے۔ کچھ کرنا ہے ــــــ ورنہ۔ ورنہ میں اپنی اس ڈگری کو جلا کر راکھ کر دوں گا۔"

"تم بہت بے صبر ہو گئے ہو ملک۔ انتظار کا ثمر بہت میٹھا ہوتا ہے۔"

"مجھے ڈر ہے شالو۔ میری یہ جھلاہٹ کسی دھماکے کا باعث نہ بن جائے۔"

"نہیں ایسا نہ کہو ــــــ میں جو تمہاری ہم قدم ہوں" ــــــ شالو کے اس جواب پر وہ چپ ہو جاتا۔

سلسلہ شب و روز جاری رہا۔ نہ حالات بدلے نہ زندگی کے نشیب میں کوئی فراز آسکا۔ نہ مایوسی کو آس ملی، نہ خواب کو تعبیر۔ اتنا ضرور ہوا کہ وہ دو سے تین ہو گئے۔ ننھا آشو آ گیا ان کے بیچ محور کی طرح۔ ملک کی جھنجھلاہٹ میں اب کچھ بغاوت بھی شامل

ہو گئی تھی۔ اور اس دن تو وہ سچ مچ پاگل ہو گیا جب آشو بروقت طبی امداد نہ ملنے پر پولیو کا شکار ہو گیا۔

کتنی منت سماجت کی تھی اس نے ہسپتال میں صبح سے شام تک وہ چلڈرنس وارڈ میں پڑا ہر ڈاکٹر اور نرس کی طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ اس کے برعکس دوسرے وارڈ میں ایک بچی کو گھیرے میں لئے کئی کئی ڈاکٹرس اور نرسیں جمع تھیں۔ یہ کسی امیر آدمی کی اکلوتی اولاد تھی۔

شام ہونے تک بچی سنبھل گئی مگر آشو تیز بخار میں پھنکتا رہا۔ شاید رات کا پچھلا پہر تھا۔ دو نوجوان مفلر سے چہرہ ڈھانپے ڈیوٹی ڈاکٹرس کے روم میں گئے چاقو کی نوک پر اُسے اٹھایا اور کار میں بٹھا کر فرار ہو گئے۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ ڈاکٹر کو جب واپس لاکر چھوڑ دیا گیا تو لوگوں نے سوالات کی بوچھار کر دی۔ وہ بمشکل سے حواس درست کر کے صرف اتنا بتا سکا کہ اسے لے جانے والے دہشت پسند تھے

ملک کو جیسے کسی بچھو نے ڈنک مارا۔ ——— "تو گویا پیسہ یا طاقت دو ہی چیزیں انسان کی یار و مددگار ہیں کیا ...... کیا مجھ میں طاقت نہیں" اس نے اپنی مٹھیاں کس لیں۔ اس کی آنکھوں میں طوفان اتر آیا۔ چہرے کی ساری رگیں تن گئیں وہ پوری قوت سے ڈاکٹر پہ جھپٹ پڑا اور گھونسوں کی بارش شروع کر دی۔ ہسپتال میں کھلبلی مچ گئی۔ تیمار دار مائیں اپنے بچوں کو سینے سے لپٹائے وارڈ کے باہر نکل گئیں۔ گلوکوس کی بوتلیں ٹوٹنے لگیں۔ وہ جیسے نیم پاگل سا ہو گیا تھا۔ اسی اثنا پولیس آ گئی۔ جوانوں نے اسے پکڑ لیا اور پھر وہ پولیس تحویل میں تھا۔

آٹھ دن بعد جب وہ ضمانت پر رہا ہو کر گھر پہنچا تو آشو ہمک کر اس کی گود میں جانے کی کوشش میں صرف کھسک کر رہ گیا۔ اٹھنا چاہا تو گر پڑا۔ ملک پہلی بار تلملا کر رہ پڑا۔

"شالو ــــ میرا گناہ کیا تھا ــــ؟

"اسے مقدر سمجھو ملک ــــ"

"نہیں ــــ وہ چیخ اٹھا" مقدر ــــ قسمت یہ .... یہ سب تو ہمارے ہاتھ میں ہے۔ میں بتاتا ہوں تمہیں یہ کیسے بدلتے ہیں ــــ" اور وہ کسی طوفان کی طرح باہر نکل گیا۔ چار دن بعد جب گھر لوٹا تو اس کا چہرہ ہر جذبے سے عاری تھا انداز میں طوفان کا سا لاابالی پن اور آواز میں ایسی کرختگی کہ گرجتے بادل بھی سہم جائیں۔

"تم بدل گئے ہو یا میری آنکھیں دھوکہ کھا رہی ہیں۔" شہلا نے اس کے سراپے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"نہ تم نہ ــــ نہ میں ــــ وقت بدل گیا ہے شالو ــــ" لو یہ کچھ سامان ہے تمہاری ضرورت کے لیے۔" اس نے ایک بیگ شہلا کی طرف کر دیا۔

"اتنی آسانی سے ضرورت کیسے پوری ہو گئی ملک۔ کیا کوئی خزانہ ہاتھ لگ گیا یا پھر ــــ؟" اس نے معنی خیز نظروں سے اُسے دیکھا۔

"جو چیز آسانی سے نہ ملے اسے زبردستی حاصل کیا جاتا ہے اس سماج کو جنگل کا قانون چاہیے۔ طاقت اور تشدد ہی اس دور کے ہتھیار ہیں۔"

"غلط ۔ تشدد درندگی کی ایک صفت ہے۔ تم ایک اچھے انسان ہو ملک ــــ یہ حیوانگی کا لباس تمہیں کہاں سے مل گیا۔ اپنا ہی گھر جلاؤ گے تو پناہ کہاں پاؤ گے ــــ"

"جس گھر کا چھت کمزور ہو جائے اس کا گرا دینا ہی بہتر ہے۔ میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں تمہارے لیے اور آشو کے لیے ــــ" ملک نے اپنا خالی بیگ کاندھے پر لٹکاتے ہوئے کہا۔

"خون کی سرخی کو مانگ کا سیندور بنانا چاہتے ہو۔ بہتا پانی سمیٹنا چاہتے ہو۔ خالی سیپ میں موتی کی تلاش محض خیال خام ہے۔" ملک کچھ سنے بغیر دروازے

تک پہنچ گیا۔

"ملک ـــــ سنو جو راستہ تم نے اپنایا ہے اس کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔ کبھی یہ سوچا تم نے ـــــ" شہلا نے راستہ روک دیا۔

"شاید ـــــ انجام وہ دیکھتے ہیں جو بے بس ہیں ـــــ میں ـــــ میں اب اتنا مجبور نہیں ہوں میں نے یہ لفظ اپنے ذہن کی ڈکشنری سے نکال کر پھینک دیا ہے۔" اتنا کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

ایک عجیب سا تناؤ اور کھنچاؤ آ گیا تھا دونوں میں ایک ایسی خلیج جو پاٹی نہیں جا سکتی تھی۔ شہلا اداس تھی اور ملک بے نیاز۔ چاہت کا پھلتا پھولتا درخت سوکھنے لگا۔ محبت کے گلاب مرجھا گئے ہر شاخ خاردار بن گئی۔

ٹرین اپنی پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی اور وہ آشو کو گود میں لیے بڑے اطمینان کے ساتھ بیٹھی تھی۔ تبھی اچانک ایک زبردست دھماکہ ہوا جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ ٹرین کی بوگیاں ہوا میں اڑ گئیں۔ انسانی اعضا چاروں طرف بکھر گئے جا بجا خون کی سرخی پھیل گئی۔

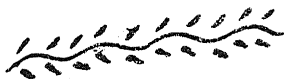
سب کو علم ہو گیا کہ یہ دہشت پسندوں کی کارروائی تھی۔ بربریت، ظلم، تشدد، جبر، طاقت، وحشیانہ پن ـــــ شاید انسانی ارتقا کی یہی آخری سیڑھی ہے جہاں حرف اور حرف آدمیت کا خون بہتا رہتا ہے اور انسانیت دور کھڑی بے بس تماشائی کی طرح زندگی اور موت کے رشتوں کو دیکھتی رہ جاتی ہے۔

تحقیقات، قانونی کارروائی، پوسٹ مارٹم، ایکس گریشیا ـــــ اور بس داستاں مکمل ہو جاتی ہے۔

ملک بڑے اطمینان کے ساتھ گھر لوٹا تو پڑوس کے ایک لڑکے نے اس کے ہاتھ میں خط تھما دیا۔

"ملک۔ کتنی معمولی سی بات ہے تمہارے لیے ـــــ جو سوچا سو کیا۔ دھماکہ ہو گیا۔ جیسے دیوالی میں پٹاخے چھوٹ گئے ہوں مگر اب ایک ایسے دھماکے کیلیے تیار ہو جاؤ شاید جس کا تمہیں گمان نہ ہو۔ میں تمہارا پلان جانتی تھی۔ تم لوگوں نے انتقامی کارروائی کا جو منصوبہ بنایا ـــــ یہ نہ سوچا کہ یہ انتقام کسی ایک کے ساتھ نہیں اپنے آپ سے بھی ہو سکتا ہے میں جان بوجھ کر اس ٹرین میں بیٹھ گئی ـــــ تمہارے لیے یہ سب کچھ کر رہے ہونا ـــــ لو! آج ہم تمہیں اس سے نجات دے چلے۔ ہو سکے تو بکھرے ہوئے جسم کی ان دھجیوں میں سے مجھے اور آشو کو تلاش کر لو ـــــ"

خط ملک کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اس نے محسوس کیا اس کے ذہن و دل میں زبردست دھماکہ ہوا جس نے اس کے وجود کے ٹکرے ٹکرے کر ڈالے اس کے قدم پولیس اسٹیشن کی طرف بڑھ گئے۔ اور وہ سوچنے لگا مجرم کون ہے ـــــ؟



ایک شیشہ اور لوٹا

"جنید صاحب! آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔
طوفان کے تھپیڑے کھائی ہوئی کشتی کناروں پر بھی لرزتی
ہوئی بڑھتی ہے کہ کہیں پھر کوئی طوفان نہ آجائے۔"
"سچ پوچھیے تو کشتی کو منزل تک پہنچنے کے لیے طوفان
میں ڈوبنا اور ابھرنا، بھنور میں پھنس جانا اور نکلنا ضروری ہے
اسی میں تو زندگی کا لطف ہے۔"
"یہ صرف افسانوی باتیں ہیں جنید صاحب۔ عملی میدان
میں یہی باتیں ساکت ہو کر رہ جاتی ہیں۔"
"یقین نہ ہو تو آپ مجھے آزما سکتی ہیں۔"
"لیکن اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔"
"اس لیے کہ آپ کو کعبۂ دل کا صنم بنایا ہے اور سجدے
کی اجازت مانگتا ہوں۔"

ایک شیشہ اور ٹوٹا

(اس نے گھبرا کر آنکھیں موند لیں۔)
"نہیں پپا نہیں ——" وہ دوڑ کر ان کے قریب پہنچی۔
("شانو! میری بچی"۔ ان کی زبان لڑکھڑانے لگی۔)
"پہلے کہئے کیا بات ہے۔" اس نے ان کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔
"میری بچی! میں اپنا .... فرض .... ادا نہ کر سکا....
.... مجھے معاف کرنا ...." وہ رکی رکی سانسوں میں کہہ رہے تھے۔
"پپا ...." وہ بلک پڑی۔
("شانو .... میں نے بڑے جتن کیے .... ساری زندگی
.... تیری شادی کے خواب .... دیکھتا رہا ...... مگر ....
وہ رک گئے۔ ماحول کا سینہ شانو کی سسکیوں سے دہل رہا تھا۔
مگر .... مگر خواب بکھر گئے .... ارمان بجھ گئے۔ شانو
زمانے نے مجھے دھوکہ دیا .... جن سے اُمید تھی انھوں نے لوٹ لیا ——
شانو میری بچی .... آہ .... یہ بد نصیب باپ تجھ سے .... معافی
مانگتا ہے ...." انھوں نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ اور شانو کو ایسا لگا

جیسے کعبہ لرز رہا ہو وہ آنسوؤں میں بہا گئی۔

"پپا۔ آپ کی قسم مجھے اس کا کوئی دکھ نہیں۔ قدرت جو بھی کرتی ہے اس میں بہتری ہی ہوتی ہے آپ اس کی فکر کیوں کرتے ہیں۔ میں ساری زندگی آپ کی خدمت میں گذار لوں گی پپا۔ وہ اُن سے لپٹ گئی لیکن دوسرے ہی لمحہ اُسے یوں لگا جیسے وہ برف بنی جا رہی ہو۔ اس کا سارا جسم سُن ہو گیا۔ چند لمحوں بعد جب اس نے سر اُٹھایا تو اس کی گود سے دوسرا سر ڈھلک چکا تھا۔ بے نور آنکھوں میں ٹھہرا ہوا ایک آنسو اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ مرنے والے نے آخری سانس تک آنسو بہائے ہیں۔

"پپا —— " ایک دلدوز چیخ فضا میں اُبھری اور زمین نے اپنا سینہ شق کر لیا گویا ہر دُکھ کو اپنے دامن میں چھپانا ہی اس کا فرض ہو۔

"وہ کالج کے لان پر تنہا بیٹھی تھی۔ تنہائی نے یادوں کے بند کواڑ کھول دیئے۔ وہ پرسکون صبح اُسے یاد آئی جب وہ اپنے ماں باپ کے ہمراہ نینی تال گئی تھی۔ یہاں کے حسین نظاروں، دلفریب کہاروں اور پاگل بادلوں کے بیچ رہ کر اسے جنت کا گماں ہونے لگا تھا۔ کتنے حسین دن تھے وہ بھی۔

پھر وہ ہولناک شام آئی جب اس کی ممی نینی تال کی اونچی اونچی چوٹیوں سے پھسل کر گہری کھائی میں جا پڑیں۔ ممتا کا محل ٹوٹ گیا۔ اس کے پپا دکھ سے نڈھال ہو گئے۔ اس وقت وہ صرف دس سال کی تھی۔ شعور کی منزلیں اس نے مکمل طور پر طے نہیں کی تھیں لیکن یہ بات اس کے تحت الشعور میں ایسے رچ بس گئی جیسے رگوں میں دوڑتا ہوا یہ خون۔ وہ زندگی کی اس کمی کو شدت سے محسوس کر رہی تھی۔ سہیلیوں کے گھر جب وہ جاتی تو حسرت سے ان کی ماؤں کو دیکھتی اور اسے محسوس ہوتا کہ اس کے دل کا ایک شیشہ ٹوٹتا ہے۔

وقت گذرتا رہا، پر لگا کر اڑتا رہا، منزلیں طے ہوتی گئیں، نقشِ ناتمام مکمل ہوئے۔ آنے والے آتے رہے، قافلے بنتے اور بگڑتے رہے۔ خزاؤں نے بہاروں کو گلے لگایا اور بہاروں نے خزاؤں کو اپنایا۔ یہ سلسلۂ ہائے دراز چلتا ہی رہا۔ شانو شباب کی سرحدیں عبور کر رہی تھی۔ اس کا نکھرا ہوا حسن کسی گلشنِ رنگین سے کم نہ تھا۔ ایاز اس کی زندگی میں نور بن کر بکھر گیا۔ ایاز جو اس کی منزل تھا۔ اس کا رشتہ بہت پہلے ایاز سے طے پا چکا تھا۔ ایاز اس کے پپا کے دوست کا لڑکا تھا۔ اس کے والد کا بھی وسیع کاروبار تھا۔ شانو کی اکثر شامیں ایاز کے ساتھ گذرتیں۔ اس کی زندگی بہتی ندی کی طرح رواں تھی ہر صبح صبحِ بنارس ہر شام شامِ اودھ اور ہر شب شبِ مالوہ تھی۔ زندگی کا سارا حسن، ساری رعنائیاں وہ ایاز کے ساتھ مل کر لوٹ رہی تھی پھر یکایک جیسے بھونچال آگیا۔ اس کے پپا کا بزنس بری طرح ٹھپ ہوگیا۔ اور کئی لاکھ کا دیوالیہ نکل گیا۔ اسی شام ایاز کے والد نے شانو سے رشتہ توڑ دیا۔ اور صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ "دنیا دولت کے بل پر جیتی ہے جو دولت نہیں رکھتا اس کو دنیا میں جینے کا حق نہیں — خاں صاحب! پہلے دولت جمع کیجئے پھر بیٹی کی شادی کی فکر کیجئے۔ میں ایاز کو سکوں میں تولنا چاہتا ہوں کھوکھلی آرزوؤں میں نہیں۔"

شانو کے پپا کو دل کا دورہ پڑ گیا۔ وہ اس صدمے کی تاب نہ لا سکے۔ پھر ایک بار شانو کے دل کا شیشہ ٹوٹا۔ زخموں پر تیل ہی چھڑکا گیا۔ ممی کی موت کا گھاؤ ابھی مندمل نہ ہوا کہ پپا کی کشتیٔ حیات اسے ڈولتی نظر آئی اس وقت شانو نے بڑی خود اعتمادی سے اپنی شرم کو بالائے طاق رکھ کر کہا۔

"مجھے ایاز پر بھروسہ ہے پپا۔ آپ کے خاطر میں اپنا دامن پھیلا لوں گی۔" اور پھر شانو نے سچ مچ ایاز کا ہاتھ تھاما اور کہا "ایاز میں اپنے لیے

نہیں اپنے پپا کے لئے تم سے بھیک مانگتی ہوں۔ اپنی محبت کا واسطہ میں نہیں دوں گی۔ پیار میں ڈوبے ہوئے ان لمحوں کو نہیں دہراؤں گی۔ میں صرف اپنے پپا کی زندگی کے لیے تمہارا تعاون چاہتی ہوں۔ دولت اور زندگی دونوں ایک ترازو میں رکھ کر دیکھو زندگی دولت سے کہیں زیادہ بھاری ہے۔ ایاز میرے اعتماد اور بھروسے کی لاج رکھ لو۔ پپا کی زندگی کو تمہارے اقرار کی ضرورت ہے۔" شانو نے اپنا دوپٹہ پھیلا دیا۔

"شانو میں تمہاری قدر کرتا ہوں۔۔۔۔۔ ابا جان کے غصے سے تم واقف ہو۔ ان کی ضد کے آگے میں مجبور ہوں۔ مجھے غلط نہ سمجھو ۔۔" شانو لرز کر رہ گئی بالکل اس زرد پتے کی طرح جو ہلکی سی ہوا چلنے پر بھی جھڑ جانے کے خوف سے لرزتا ہے۔ پھر اس نے پھیلا ہوا دوپٹہ سمیٹ لیا جیسے ساری آرزوئیں اور امیدوں کو یکجا کر لیا ہو۔

"مجھے تم سے اب کچھ نہیں کہنا ہے" اور پھر وہ واپس چلی آئی، پھر ایک بار اس کے دل کا شیشہ ٹوٹا جھوٹی ہنسی چہرے پر لا کر اس نے اپنے پپا کو غلط بتایا کہ ایاز راضی ہو چکا ہے۔ لیکن اسی لمحے کوئی آبدار موتی اس کی پلکوں پر چمکا جسے بوڑھی نظروں نے دیکھ لیا۔ اور پھر دل کا مریض جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

آہ ۔۔۔۔۔" ایک تڑپتی ہوئی آواز اس کے وجود کی گہرائی سے نکلی اور فضاؤں میں گم ہو کر رہ گئی۔ وہ ماضی کے خواب سے چونک اٹھی۔

کالج ختم ہو چکا تھا سب واپس جا رہے تھے۔ وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی

"معاف کیجئے گا ۔۔۔۔۔ شاید ۔۔۔۔۔ یہ آپ کی کتاب ہے۔" جنید اس سے مخاطب تھا۔ جنید جو ہمہ وقت پلکوں پر دل لیے اس کے جانب دیکھتا ہی رہتا کہ شاید کبھی نگاہِ کرم ہو جائے۔

"جی ہاں شکریہ۔"

"سنیے ـــــ جنید نے آواز دی۔ وہ رک گئی اور جنید کو محسوس ہوا جیسے وقت تھم گیا ہو، کائنات کی نبض رک گئی ہو۔

"گھر جا کر اس کتاب کے اوراق اچھی طرح دیکھ لیجئے گا کہیں کھو نہ گئے ہوں؟"

اتنا کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ لوبنیٰ تو بڑی دیر تک اس بات پر غور کرتی رہی۔ گھر جا کر جب اس نے کتاب کے اوراق الٹا دیئے تو ان کے درمیان گلاب کی کلی ملی جس کی ہر پتی پر سیاہی سے محبت لکھا تھا اور اسی صفحے پر نیچے درج تھا۔

"اگر اس کا جواب "محبت" ہی ملے تو یہ کلی پھول بن سکتی ہے ورنہ اسے اسی کتاب میں مرجھانے دیجئے" "منتظر نگاہِ کرم۔

جنید

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ دوسری صبح جب وہ کالج گئی تو جنید کالج کے صدر دروازے پر ہی کھڑا تھا۔

"کل کی گستاخی کی سزا چاہتا ہوں۔"

"جنید صاحب۔ آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔ طوفان کے تھپیڑے کھائی ہوئی کشتی کناروں پر بھی لرزتی ہوئی بڑھتی ہے کہ پھر کہیں کوئی طوفان نہ آجائے۔"

"سچ پوچھئے تو کشتی کو منزل تک پہنچنے کے لیے طوفان میں ڈوبنا اور ابھرنا بھنور میں پھنس جانا اور نکلنا ضروری ہے اسی میں تو زندگی کا لطف ہے"

"یہ صرف کہنے کی باتیں ہیں جنید صاحب عملی میدان میں یہی باتیں ساکت ہو کر رہ جاتی ہیں۔"

"یقین نہ ہو تو آپ مجھے آزما سکتی ہیں۔"

"لیکن اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

"اس لیے کہ آپ کو کعبۂ دل کا صنم بنایا ہے اور سجدے کی اجازت مانگتا ہوں۔"

"جو خود ساری زندگی سجدہ ریزی میں گذار چکا ہے اس کے آگے سجدوں کی اہمیت ہی کیا۔"

"میں آپ کی نہیں اپنی بات کر رہا ہوں اس پھیلے ہوئے دامن میں انکار کے پتھر نہ ڈالیے میں انہیں سے اپنے وجود کو لہولہان کر لوں گا۔"

"لیکن میں مجبور ہوں۔ للّٰہ مجھے پریشان مت کیجئے۔" شانو تیز قدموں سے آگے نکل گئی۔ جنید اس کے قدموں کی چاپ سنتا رہا۔ خاموش نگاہوں سے اس دھول کو دیکھتا رہا جو اس کے قدموں کی حرکت سے آہستہ آہستہ اڑ رہی تھی۔ پھر دن گذرنے لگے۔ شانو نے بی۔ اے۔ مکمل کر لیا۔ جنید بھی گریجویشن کر چکا۔ ریزلٹ کے بعد وہ پھر شانو سے ٹکرایا۔

"میں نے کہا تھا جنید صاحب۔ ایک دل صرف ایک ہی کے لیے دھڑک سکتا ہے مجھے تنگ نہ کیجئے۔"

"میں آپ کو تنگ نہیں کرتا۔ صرف اس کی اجازت چاہتا ہوں کہ ساری زندگی صرف آپ کی حسرت میں ہی جی سکوں۔"

"یہ بات بالکل غلط ہے۔" وہ جھنجھلا گئی۔

"جو تمنا، جو خواہش، ہوک کی طرح اچانک دل میں اٹھ جائے وہ غلط بھی ہو تو حسین لگتی ہے اس سے تو زندگی میں بہار ہے۔"

"آپ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔" شانو نے کہا۔

"سب کچھ جانتا ہوں۔ اس زخم کا نام بھی بتا سکتا ہوں جس نے آپ کے دل میں پناہ لی ہے ایاز۔"

"لیکن ۔۔۔۔ لیکن آپ کیسے جانتے ہیں ۔"

"موتی کی تلاش اگر ہو تو غوطہ زن سارے سمندر کی گہرائی ناپ لیتا ہے آپ بھی تو ایک گوہر آبدار ہیں ۔" جنید نے کہا ۔

"سب کچھ جانتے ہوئے آپ ۔۔۔۔ ۔" وہ رک گئی ۔

"ہاں آپ سے پیار کرتا ہوں ۔" جنید نے آخر کہہ دیا ۔

"اگر اس کے جواب میں میری جانب سے کچھ نہ ملے تو ۔۔۔؟"

"نہ سہی ۔ پجاری کے لیے تو یہی بہت ہے کہ جس دیوی کی وہ پوجا کرتا ہے وہ اسے درشن دیدے ۔ میں صرف آپ کو نگاہوں کا سرمہ بنا کر جی لوں گا ۔

"آپ بھی عجیب ہیں ۔" شانو حیرتوں کے ساگر میں ڈوب گئی ۔

"بس اتنی عنایت کافی ہے ۔ جنید مودبانہ سلام کر کے آگے بڑھ گیا ۔

دو سال اور گذر گئے ۔ شانو ایک پرائیوٹ اسکول میں ٹیچر ہو گئی اور جنید ایک کمپنی میں ملازم ہو گیا ۔ وہ ہر روز صبح شانو کو اسکول جاتا ہوا دور سے دیکھ لیتا ۔ سر جھکا کر سلام کرتا اور پھر اپنی سیکل کا رخ کمپنی کی جانب کر دیتا ۔ یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا ۔ شانو اس کے سلام کا جواب دیتی اور گذر جاتی ۔ آخر کار متواتر سجدوں نے لاج رکھ لی ۔ بار بار کی ضرب سے تو لوہا شکل بدل دیتا ہے اور پھر شانو تو عورت تھی ۔ جنید کا پیار رنگ لایا ۔ شانو کے ویران آنگن میں محبت کا چمن مہکا اور اس نے جنید سے ہار مان لی ۔

"میں تم سے منسلک ہونا چاہتی ہوں ساری زندگی کے لیے ۔" شانو نے ہاتھ بڑھایا ۔

"سچ شانو ! ! جنید نے فرط مسرت سے اس کا ہاتھ تھام لیا ۔ اور پھر دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے ۔ شانو دلہن بن کر جنید کے گھر آئی حیرتوں

کے دیئے جل اُٹھے، پیار کے جگنو چمکنے لگے۔ تمناؤں کے قدم رنگِ حنا سے سلونا اُٹھے آرزوں کی پائل چھنک اُٹھی۔ امیدوں کے کنگن کھنکنے لگے۔ محبت کے ماتھے پر افشاں چمکنے لگی۔ دھنک کے دل نشین رنگوں نے شالو اور جنید کو رنگ دیا۔ پہلی بار شالو نے جانا کہ دل کیوں دھڑکتا ہے، آنکھوں میں روشنی کیسے آتی ہے، پلکوں کی چلمن بے قرار رہتی ہے، ہونٹوں کی مسکراہٹ جینے کا پیام کب دیتی ہے، عارض کے گلاب کب مہکتے ہیں، زلفوں کی گھٹائیں کب گھر آتی ہیں۔ اپنا وجود معطر کیسے ہوتا ہے وہ پہلی بار اس بے پناہ خوشی سے آشنا ہوئی تھی۔ ورنہ زندگی نے عین شباب میں اس کی راہوں کو خار دار کر دیا تھا۔ اس کی مچلتی آرزوؤں پر خاک اڑائی تھی۔ جنید کی باہوں کو وہ اپنی زندگی کا ساحل سمجھتی رہی۔ اسے یقین تھا کہ اب کوئی طوفان نہیں آئے گا۔ چند لمحے اور گذرے وقت دبے پاؤں آگے بڑھ گیا۔ پھر ان کے گلشن زیست میں ایک گلاب مہکا "شہزاد"

اس کی کلکاریاں گھر کے آنگن میں گونجتی رہیں۔ شہزاد شالو اور جنید کی زندگی میں چراغ کی لو بن کر آیا۔ جس کی روشنی دونوں کو راہ دکھا رہی تھی۔ عمر کی ڈور دراز ہوئی۔ کلیاں چٹکیں اور پھول بنیں۔ شہزاد پانچ سال کا ہوگیا۔ جنید کی ترقی ہوئی اور شالو نے نوکری چھوڑ کر گرہستی سنبھال لی۔

پھر ایک دن وہ آیا جب جنید کو کسی ضروری کام کے تحت نینی تال جانا پڑا نینی تال کے نام سے شالو کے دل میں کوئی بھولی بسری یادیں چٹکیاں لینے لگی۔ یہ وہی تو تھا جس نے اس کی خوشی کو چھین لیا۔

"نہیں ـــــ آپ نینی تال نہیں جائیں گے۔ شالو لرز کر بولی۔

"تم پاگل ہو ـــ ایسے مقام پر جانے سے روکتی ہو مجھے۔" جنید نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں۔ مجھے اس نام سے وحشت سی ہوتی ہے۔ میری ممی وہاں گئیں اور لوٹ کر نہیں آئیں۔" اس کی آنکھوں میں وہم اور خوف کی پرچھائیاں رقص کر رہی تھیں۔

"نہیں شانو! ایسی وہمی باتیں نہ کیا کرو۔ میں تو چار چھ روز میں واپس آجاؤں گا۔ میرا جانا بے حد ضروری ہے۔ اور پھر جنید سچ مچ چلا گیا۔ شانو سہم کر رہ گئی۔

چار دن گذر گئے۔ یہ چار دن شانو کے لیے چار برس سے کم نہ تھے۔ جنید کے جانے کے بعد شانو محسوس کر رہی تھی کہ زندگی تپتا صحرا ہے جس میں اس کا وجود بھٹک رہا ہے اور اس وقت وہ واقعی لرز گئی جب اس کے ہاتھ میں جنید کی موت کا ٹیلیگرام آیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے دل کا ایک شیشہ اور ٹوٹ گیا۔ اس کی چبھن انگ انگ میں محسوس ہونے لگی۔ آنسوؤں کا تیز ریلا آبشار کی طرح رواں ہوا اور گالوں سے بہہ کر زمین پر آگرا۔ وہ ایک سسکی لے کر یوں چپ ہو گئی جیسے بجتا ہوا ستار کسی تار کے ٹوٹ جانے پر دم توڑ دیتا ہے۔

"ممی لولو نا ۔۔۔۔۔" ننھا شہزاد اس کے پیروں سے لپٹا ہوا تھا۔ اس وقت شانو نے محسوس کیا کہ وہ صرف بیوی ہی نہیں بلکہ ماں بھی ہے۔ ماں ــــــ کتنا امرت بھرا ہے اس لفظ میں کتنا سکون ہے ان تین حرفوں میں۔ فلک کی رفعت، سمندر کی وسعت، کوہ کی بلندی، گھنے درختوں کی چھاؤں، چشمے کی ٹھنڈک، ہواؤں کی خنکی، ابر کا سایہ، دھرتی کا سینہ، ان سب کو یکجا کر کے قدرت نے اس عظیم ہستی کی تخلیق کی جس کو "ماں" کہتے ہیں وہ اپنے نام کی گہرائی میں ڈوب گئی۔

"ممی" ــــــ شہزاد نے اُسے جگایا۔

"شہزاد ــــ میرے بچے، میرے لال، وہ سوتے میں جاگ پڑی۔

"ممی۔ پپا کہاں ہیں ممی بولو نا ــ"

"بیٹا ــ تیرے پپا چندا ماما کے پاس گئے ہیں۔" وہ خلاؤں میں گھورتی ہوئی بولی۔

"ممی۔ میں بھی جاؤں گا وہاں راکٹ پر بیٹھ کر۔ میں جاؤں ممی ــ شہزاد نے ننھے ننھے ہاتھ اس کے گیلے گالوں پر پھیر دیئے۔

"نہیں شہزاد نہیں ــــ ایسا نہیں کہتے بیٹے۔" اس کی سسکی کچھ تیز ہو گئی جیسے چراغ بجھنے سے پہلے بڑے زور سے بھڑکتا ہے۔

"پھر پپا کو تم نے کیوں نہیں روکا ممی ــــ شہزاد نے معصوم تیر چلا دیا۔

"شہزاد ــــ اور لاکھ ضبط کے باوجود شانو جل تھل ہو گئی۔

پھر آہستہ آہستہ وقت کسی بوڑھے قدموں کی طرح بڑھنے لگا۔ شانو نے کبھی شہزاد کو یہ محسوس ہونے نہیں دیا کہ جنید مر چکا ہے اس نے پھر سے نوکری کر لی۔ وہ اپنے آپ کو مصروف رکھنا چاہتی تھی کیوں کہ مصروفیت ہی وہ مرہم ہے جو ہزار غم بھی اپنی وجہ سے بھولنے پر مجبور کرتی ہے۔ جنید کی عطا کی ہوئی بخشش کو وہ اپنا خون جگر دے کر سنوار رہی تھی۔ اس کی ویرانیاں تھیں اور شہزاد کا مستقبل تھا۔

وقت کی بارش تھی۔ بوندوں سے دریا، دریا سے سمندر بنا۔ شہزاد کا بچپن جوانی میں بدلا اور شانو کا شباب بڑھاپے کی سمت رواں ہوا۔ ایک طرف بہار دوسری طرف خزاں، ایک جانب سویرا دوسری جانب اندھیرا، ایک سمت موجوں کا شور، دوسری طرف ساحل کا سکوت ــــ اب شہزاد انجنیئر تھا۔ شانو کی محبت رنگ لائی، جنید کی روح کو چین ملا ــــ پھر شانو نے بڑے ارمانوں سے شہزاد کو سہرا باندھا اور سمیرہ بہو بن کر آئی۔ سمیرہ دولت مند باپ کی مغرور لڑکی تھی۔

شہزاد کی آنکھوں میں چھلکتے ہوئے پیار کے جگنو شانو نے دیکھے اور اس کی خوشی کے لیے نواب احتشام کے آگے دامن پھیلایا۔ مگر سمیرہ شانو کی عظمت کی معترف نہ ہو سکی۔ وہ یہ نہ جان سکی کہ ایک ماں اپنی اولاد کے لیے کیا کر گذرتی ہے اس نے صرف یہی سمجھا کہ وہ ایک دُرِ نایاب ہے جس کو پانے کے لیے شانو نے نواب احتشام سے بھیک مانگی —— کاش وہ جان سکتی کہ ماں تو کبھی کبھی اپنے بچوں کے لیے خود کو خیرات میں دے دیتی ہے۔ لیکن شانو کو سمیرہ سے گلہ نہ تھا۔ وہ شہزاد سے دکھی ضرور تھی جس نے اس کی ہستی کو نظر انداز کرنا شروع کیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے دیئے مدھم ہو رہے تھے۔ اس کی سیاہ زلفیں سفید ریشم میں بدلنے لگی۔ رات بھر وہ جاگتی، غم کی بھٹی اور تنہائی کے الاؤ میں جلتی مگر کسی کو اتنا ہوش نہ تھا کہ اس کے دُکھ کا مداوا کرے۔ سب اپنی اپنی خوشیوں میں مگن تھے۔

"جنید —— دیکھو تو تمہارا بیٹا کتنا خوش ہے تمہاری بہو کتنی خوش ہے میں نے اپنا فرض پورا کیا۔ تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہو نا! لیکن میں —— میں کیوں اداس ہوئی جارہی ہوں۔" اور پھر اس کی آنکھوں سے موتی گر گر کر ٹوٹنے لگے۔ وہ اندھیروں میں ان موتیوں کو سمیٹنے لگی مگر وہ ٹوٹ جاتے اور اس کے ہاتھ گیلے ہو جاتے

وقت آگے ہی آگے بڑھتا رہا پھر اچانک ایک ملگجی شام کو شہزاد آیا۔

"ممی۔ میں اور سمیرہ امریکہ جا رہے ہیں ہماری سیٹیں بک ہو چکی ہیں۔" جیسے بم کا دھماکہ کسی ویرانے میں گونجے۔ شہزاد نے کہا اس غیر متوقع حملے کی شانو کو امید نہ تھی

"کیا —— ؟ وہ کچھ دیر تک خود کو بے جان سمجھتی رہی لیکن جب دل کی دھڑکن نے شدت اختیار کی تو وہ بہ مشکل کہہ سکی۔

شہزاد خونِ جگر سے سینچا ہوا درخت جب ٹھنڈی چھاؤں دینے کے قابل ہو جاتا ہے تو راہرو اس میں پناہ لیتے ہیں اور میں ——— میں تو وہ زمین ہوں جس پر یہ درخت کھڑا ہے۔

"ممی۔ آپ کی فلسفیانہ باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔"

"شہزاد ——— تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے ———" ! شانو امڈ چلی آ رہی تھی۔

"ممی۔ آپ سمجھتی کیوں نہیں۔ یہاں رکھا ہی کیا ہے اگر میں امریکہ چلا جاؤں گا تو قسمت بدل جائے گی۔ سمیرہ کی بھی یہی خواہش ہے کہ ہم اپنی شادی کی پہلی سالگرہ وہاں منائیں۔ یہاں ساری زندگی محنت کر کے اتنا نہ کما سکوں گا جتنا وہاں مجھے صرف ایک سال میں ملے گا اور پھر وہاں Settle ہونے کے بعد آپ کو بلوائیں گے۔"

شہزاد نے جھوٹی تسلیوں کا آشیانہ بنانا چاہا۔

"شہزاد تم دولت کمانے کے لیے اپنی ماں کو بھی چھوڑ کر جاؤ گے" شانو نے اپنے وجود کو منوانے کی کوشش کی۔

"میں وہاں جا کر آپ کو بلوا لوں گا" شہزاد پیچھا چھڑانے کی فکر میں تھا۔

"بیٹا۔ تم ہلال سے بدر کامل بن گئے اور جب تمھیں اجالوں کی ضرورت ہے تم گھٹاؤں میں چھپ رہے ہو۔ میں نے تم کو اس لیے اتنا بڑا تو نہیں کیا تھا کہ ! تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ۔ میں تمھارے بغیر سانس کیسے لے پاؤں گی۔

ممی آپ نے بھی وہی کیا جو ہر ماں کرتی ہے کیا آپ مجھ سے اپنے احسانوں کا معاوضہ طلب کر رہی ہیں۔ کیا ہر ماں اپنے بچوں کے روشن مستقبل پر اپنی ممتا کی مہر لگا دیتی ہے۔ وہ تو اس کا فرض ہی ہوتا ہے۔"

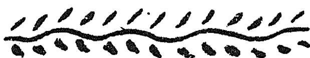
"تم ٹھیک کہتے ہو شہزاد ! تم وہاں جاؤ گے، دولت کماؤ گے

تمہارا مستقبل سنور جائے گا۔ جاؤ بیٹا ضرور جاؤ۔ میری عمر ڈھل گئی ہے نا! اسی لیے سٹھیا جاتی ہوں۔ بھلا سوچو تو محبت کا واسطہ دینے کا یہ کون سا موقع تھا۔ شانو نے غم کو سہہ لیا۔

"اوہ ممی۔ آپ کتنی اچھی ہیں۔" اور شہزاد فواروں سے نکلتے ہوئے پانی کی طرح اچھلتا ہوا باہر نکل گیا۔

شہزاد کے جانے کا وقت آیا۔ جہاز پرواز کے لیے تیار تھا۔ سمیرہ اور شہزاد دونوں اُس سے رخصت ہو کر جہاز کی جانب بڑھ گئے۔ وہ لوکھلائی نظروں سے انھیں دیکھتی رہی

تب ——— "دفعتاً اس کے ہاتھ پر پانی کی ایک بوند پڑی۔ تب وہ چونک اُٹھی۔ ارد گرد دیکھا پھر اوپر کی جانب دیکھا۔ آسمان ابر آلود تو نہیں تھا پھر بھی بارش کہاں سے ہوئی ——— لیکن جب اس کے ہاتھ اپنے گالوں کی طرف بڑھے تو وہاں آنسو بہتا دکھائی دیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس بار اس کے دل کا ایک اور شیشہ ٹوٹا ہے اور اس کی کرچیں اس کے سارے وجود کو لہولہان کر رہی ہیں۔ یہ خون ہی تو تھا جو آنسو کی شکل میں آنکھ سے ٹپک پڑا۔ وہ شدت جذبات سے مغلوب ہو کر ایرپورٹ سے نکل گئی۔



درد اور درماں

"بیٹا! ماں تو ماں ہوتی ہے چاہے وہ رام کی ہو یا رحیم کی ——— اس کا دھرم اور مذہب تو اس کی ممتا ہے۔ دُعا اور آشیرواد اس کی بولی۔ مگر ہر دور میں ماں نے دُکھ جھیلا۔ چوٹ اسے لگی۔ گھائل وہ ہوئی، خون اس کا بہا ٹکڑے اس کے ہوئے ——— کبھی مندر کے نام پر تو کبھی مسجد کے نام پر۔" . . . .

درد اور درماں

رات کا پر ہول سناٹا، خاموشی کے دبیز پردوں کو چاک کرتی پولیس کے جوانوں کے قدموں کی آہٹ خوف و دہشت کے رینگتے سائے اندھیروں کی سیاہ چادر اوڑھے ماحول کی پر اسرار سرگوشیاں۔

سارا علاقہ کرفیو کی زد میں تھا۔ وہ بے چاری آنکھوں سے مجبور بڑھاپے سے لاچار اپنے نحیف و ناتواں جسم کو کمزور پیروں پر سنبھالے دروازے کی زنجیر کو تھامے وہ دہلیز پر بیٹھی تھی۔ ہوا کے جھونکوں سے لرزتے ہوئے سوکھے پتوں کی طرح اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ اس کا وجود ایک بوسیدہ چھت کی طرح تھا۔ اس کے جھریوں بھرے چہرے پر انتظار کی جان لیوا کسک تھی۔

کتنی بار کہا کہ وقت پر گھر آجائے۔ مگر جانے کہاں کہاں گھومتا رہتا ہے۔ اس کے لبوں سے ایک آہ نکل گئی۔

"پتہ بھی نہیں چل سکتا کہ چراغ جلے یا نہیں ــــــ مگر کتوں کے بھونکنے کی آواز تو آنے لگی ہے کیسی خاموشی ہے ہر طرف ــــــ لیکن ــــــ لیکن سیٹیاں تو بج رہی ہیں شاید پولس والے لوگوں کو خبردار کر رہے ہیں۔ اونہہ یہ کم بخت کہاں چلا گیا۔"

وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ تبھی کسی نے دروازہ ڈھکیلا۔ اس نے زنجیر کھول دی اچانک دھڑام سے کوئی چیز اس کے قریب گری۔

"بیٹا ——— چوٹ تو نہیں آئی۔ آج شاید بجلی پھر چلی گئی۔ اسی لیے تو دیکھ نہ پایا۔" اس نے کپڑوں کی سرسراہٹ محسوس کی۔

"چل تو ہاتھ منہ دھولے میں کھانا لاتی ہوں۔ بڑھیا آہستہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"بھلا کیا وقت ہوگا اب ———" اس نے سوال کیا جواب میں خاموشی رہی۔

"تو نے جواب ہی نہیں دیا۔ کیا بات ہے۔ آج چپ کیوں ہے؟"

وہ اندھیرے میں برتن ٹٹول رہی تھی پھر بھی خاموشی رہی۔

"شاید بہت بھوک لگی ہے تجھے ——— کیا آج پھر کسی سے الجھ کر آیا ہے۔ دیکھ بیٹا! چار دن کی اس زندگی میں کیا لڑنا کیا جھگڑنا ——— خود بھی سکھ سے جی اوروں کو بھی ———

"چل آجا یہاں بیٹھ ——— اس نے دالان میں بچھے تخت پر بیٹھے ہوئے کہا۔

"میں جانتی ہوں ——— جب تک تیرا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوگا تو بولے گا نہیں۔" وہ مسکرائی اندھیروں میں ایک نور سا چمکا۔

"تو بیٹھا کہ نہیں ———" بڑھیا نے تخت پر ٹٹولا ——— اس کے ہاتھوں کو لمس کا احساس ہوا۔

"میں کھلاؤں گی تجھے اپنے ہاتھ سے ———" بڑھیا نے ٹٹول کر روٹی ہاتھ میں لی۔ سالن کے کٹورے میں ڈبو کر ایک لقمہ آگے بڑھایا

پگلا کہیں کا ـــــــ کھانے پر غصہ نکالتا ہے کھائے گا نہیں تو صحت بگڑ جائے گی پھر اس اندھی ماں کو کیسے سنبھالے گا تو لے کھا لے" یہ کہتی ہوئی وہ دوسرا نوالہ آگے بڑھانے لگی۔ اس دوران بڑھیا کھانا کھلاتی رہی اور باتیں کرتی رہی وہ کھاتا رہا اور چپ رہا۔

کھانے کے بعد اس نے اپنے آنچل سے اس کا منہ صاف کیا۔ بالوں پر ہاتھ پھیرتے وہ یکبارگی چونک سی گئی۔

"یہ .... یہ تیرے بال اتنے الجھے کیوں کیے ــــ؟"

اسے کوئی جواب نہیں ملا بڑھیا نے اس کے چہرے کو ٹٹولا ـــــ تو نے ...
...... تو نے شیو بھی نہیں کیا ـــ" پھر بھی جواب نہ ملا۔ بڑھیا اس کے گریبان اور شانوں کو ٹٹولنے لگی۔ تیرا وہ تعویذ کہاں ہے جو میں نے نظر سے بچنے کے لیے تجھے باندھا تھا۔" بڑھیا نے اس کے بازو کو چھو کر کہا وہ پھر بھی چپ رہا۔ مگر اس کی تیز تیز سانسیں اس سے چھپی نہ رہ سکیں

"اچھا جانے دے ـــــ شاید کھو گیا ہو گا گھبرا نہیں میری گود میں سر رکھ کر سو جا ساری بلائیں میں لے لوں گی۔ آ میرے بچے میرے قریب آ جا۔"

وہ تامل نہ کر سکا۔ اس نے اپنا سر بڑھیا کی گود میں رکھ دیا ایک پل کے لیے اسے محسوس ہوا۔ جیسے وہ پالنے میں ہو۔ نیند کی دیوی اس پر مہرباں ہو گئی۔

پتہ نہیں رات کا وہ کون سا پہر تھا ـــــ جب دروازہ ایک دھماکے کے ساتھ کھلا۔ اندھیرے میں اس نے دیکھا ایک سایہ اس کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ آنے والے کے ہاتھ میں لاٹھی صاف نظر آ رہی تھی

وہ بھی پوری طرح چوکس ہو گیا۔ کمرے میں بند مٹھا چاقو تو اس نے بھی نکال لیا اور جھٹکے کے ساتھ بڑھیا کی گود سے اٹھ بیٹھا ـــــــ

"ارے کیا ہو گیا ـــــــ کون ہے ـــــــ؟ یہ کس کی آواز ہے۔" بڑھیا خود کو سنبھالتی ہوئی سوالات کر رہی تھی بجائے اس کے کہ کوئی جواب ملتا دونوں ایک دوسرے سے الجھ گئے۔ بڑھیا ٹٹولتی ہوئی قریب پہنچ گئی۔ اس نے اپنی دونوں بانہیں پھیلا دیں۔

"رک جاؤ ـــــــ رک جاؤ۔

اور پھر بجز ایک کمزور سی چیخ کے کچھ سنائی نہ دیا لاٹھی زمین پر گری اور چاقو آنگن میں۔

"اماں ـــــــ

ماں جی ـــــــ

بیک وقت دو آوازوں نے ماحول کا سینہ چاک کر دیا۔ تبھی روشنی سی چمکی شاید بجلی آ چکی تھی۔ بڑھیا کے ماتھے پر لاٹھی کا ضرب تھا اور سینے پر چاقو کا گھاؤ۔ دونوں ہی جگہ سے خون رس رہا تھا۔ سفید کپڑوں اور اجلے بالوں میں سرخ سرخ بہتا ہوا خون جیسے برف میں گلاب گھل گئے ہوں۔

دونوں ہی بڑھیا کے قریب آ گئے جیسے وہ ان کی ملکیت ہو۔

"ہٹ جاؤ یہاں سے یہ میری ماں ہے ـــــــ" پہلے نے کہا۔

"تو نکل جا یہاں سے یہ میری ماں ہے ـــــــ" دوسرے نے جواباً کہا۔

"بیٹا ـــــــ" بڑھیا کے سوکھے لب مرتعش ہوئے۔

ماں تو ماں ہوتی ہے چاہے وہ رام کی ہو یا رحیم کی ـــــــ اس

کا دھرم اور مذہب تو اس کی ممتا ہے دعا اور آشیرواد اس کی بولی۔ مگر ہر دور میں ماں نے دکھ جھیلا چوٹ اسے لگی۔ گھائل وہ ہوئی، خون اس کا بہا ٹکڑے اس کے ہوئے بھاشا نے اس کے کیٹے ——— کبھی مندر کے نام پر تو کبھی مسجد کے نام پر، کبھی بھاشا کے لیے تو کبھی بولی کے لیے۔ کبھی ذات پات کے لیے تو کبھی رنگ و نسل کے لیے ——— شاید ماں کی قسمت میں تخلیق کے کرب کے ساتھ ساتھ اولاد کا دکھ بھی جھیلنا لکھا ہے۔" اتنا کہتے کہتے بڑھیا نڈھال سی ہو گئی۔ اس کے زخموں سے اب بھی خون بہہ رہا تھا۔

"چلو ہم ماں کو ہسپتال لے چلتے ہیں۔

"میں اسے اپنا خون دے دوں گا۔

"میں اس کے لیے اپنی جان دے دوں گا۔

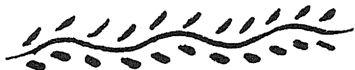
دونوں ہی یک وقت ایثار کے لیے تیار ہو گئے۔ زخم کو مرہم درد کو درماں مل گیا۔

"نہیں میرے بچو! یہ زخم بھر جائیں گے یہ گھاؤ مٹ جائیں گے بس ——— مجھے تم دونوں کا سہارا چاہیئے۔ میرے بازو تھام لو میں آپ ہی آپ اٹھ جاؤں گی۔ میرے قدم کبھی لڑکھڑائیں گے نہیں ——— میں گر نہیں پاؤں گی۔ کوئی مجھے دھکا نہ دے سکے گا۔ بس تمہارا ساتھ چاہیئے مجھے۔ تم دونوں کے بل پر ہی میں زندہ رہ سکتی ہوں ———"

ممتا کے اس جذبے نے نفرت کو محبت سے بدل دیا۔ دونوں نے اپنی ماں کو کاندھے پر اٹھا لیا ———

ٹیبل پر رکھا ہندوستان کا نقشہ پنکھے کی تیز رفتاری سے پھڑپھڑا رہا تھا۔ مصدر نے تیزی سے آنکھیں جھپکائیں ——— اور

پھر اسے یاد آیا وہ تو اس نقشے میں رنگ بھر رہا تھا نہ جانے کیسے اسے نیند آ گئی۔ اور اس نے خوابوں کی دنیا میں اپنی مادر وطن کو تلاش کر لیا۔ اس کا ہاتھ رنگوں سے کھیلنے لگا اس کے چہرے پر ابھرتے سورج کی کرنیں بکھر گئیں۔



چاند پھر نکلا

"میرا چاند تو ہر شب میرے دل کے آنگن میں چاندنی بکھیرتا ہے فلک کے اس چاند سے میرا کیا ناطہ ــــــ"! اس کا ساجن دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ اٹھا کر کہتا۔

چاند پھر نکلا - - - -

"آؤ چاند دیکھیں ـــــ" اس کی بہنوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا

"نا بابا ـــــ میں نہیں آؤں گی چھت پر" وہ ادائے بے نیازی

سے سیڑھیوں پر ہی بیٹھ گئی۔

"تجھے چلنا ہی ہوگا بے پرواہ ـــــ" سب نے مل بول دیا۔ وہ لاچار

ہو گئی

شانوں پر بکھرے آسمانی دوپٹے کو سر پر ڈال لیا اور چھت پر پہنچ گئی۔ سب

کی نگاہیں فلک پر چاند کی تلاش میں تھیں وہ چاند کی رونمائی سے بے نیاز چھت

کی منڈیر پر دونوں کہنیاں لگائے پرندوں کے قافلے کو دیکھ رہی تھی جو اپنے آشیاں

کی طرف رواں تھے۔

اچانک اس کی نگاہ سامنے والی بالکونی پر پڑی۔ وہ گھبرا کر پلٹ

گئی۔ وہ عمیق نگاہیں اس کا بھرپور جائزہ لے رہی تھی۔ جیسے فلک کے بجائے زمین

پر چاند کی تلاش ہو۔

تبھی شور اٹھا "چاند نظر آگیا ـــــ وہ ـــــ وہ دیکھو" انگلی

کی سیدھ میں۔ "ہاں ـــــ ہاں۔ اس مینار کے اوپر ـــــ" پھر چند لمحے جیسے

ساکت ہو گئے۔ چاند مبارک کی بازگشت سنائی دینے لگی سب گلے مل رہے

تھے۔ اسے بھی کسی نے کھینچ کر گلے لگا لیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی نگاہ پھر وہیں پہنچی وہی مسکراتا چہرہ اور وہی عمیق نگاہیں۔ وہ سٹ پٹا کر سیڑھیوں کی طرف بھاگی گویا نظروں کا تعاقب اسے بدحواس کئے دے رہا تھا۔

چند ماہ گزرے ——— گھر میں ڈھولک کی تھاپ گونجی۔ سرخ گھونگھٹ اپنی تقدیر پر نازاں ہوا۔ اور پھولوں کی شادابی بڑھ گئی۔ مبارک سلامت کے شور میں وہ بابل کے گھر سے پیا کے گھر تک پہنچی۔

"وہ حسین و تابناک رات جب کسی نے اس کا گھونگھٹ اٹھایا اور کہا "آج ہلال بدر کامل بن گیا۔ میرے دل میں چاندنی اتر آئی خدارا۔ اپنی نگاہوں کی آب و تاب سے میری تمناؤں کو جگمگا دو ———" اس التجا نے اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کیا۔

وہ حیران رہ گئی ——— وہی مسکراتا چہرہ اور وہی عمیق نظریں ——— اس کے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ فلک کا چاند مسکرا رہا تھا۔

جانے کیوں ——— چاند اس کی زندگی میں بڑی اہمیت کا حامل بن گیا۔ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو چاند دیکھنے کے بعد اس کی صورت دیکھنا گویا سارے گھر والوں کا فریضہ بن گیا تھا۔

"بہو کو دیکھ لیا ——— اب خیر سے گزرے گا یہ مہینہ" ——— ساس کہتیں۔

"بھابھی کی صورت دیکھ لی نا! اب تو ہر جگہ کامیابی ملے گی مجھے" نند اٹھلا کر کہتی۔

"میرا چاند تو ہر شب میرے دل کے آنگن میں چاندنی بکھیرتا ہے فلک کے اس چاند سے میرا کیا ناطہ۔" اس کا ساجن دونوں ہاتھوں میں اس کا

چہرہ اٹھا کر کہتا۔
خوشیاں ہی خوشیاں بکھری پڑی تھیں۔ دن عید اور رات برات تھی۔ گویا اس کا گھر جنت بن گیا۔

چند سال گزرے ——— رمضان کی ۲۹ تاریخ آئی۔ گھر کی چھت پر سروں کا سیلاب چڑھ آیا۔ سبھی کی نگاہیں فلک پر مرکوز ہو گئیں۔

"چاند نظر آگیا" کا شور اٹھا۔ نقرئی قہقہے فضاؤں میں جلترنگ بجانے لگے۔ مہندی تیار ہونے لگی۔ دوپٹوں کے گوٹے ٹکنے لگے۔ کلائیوں کے لیے چوڑیاں کھنکھنے لگیں۔

"ارے ——— بھابی۔ آپ نے چاند نہیں دیکھا" نند نے سوال کیا ——— اس نے نگاہیں اوپر اٹھائیں۔

"آئیے میرے ساتھ" وہ اُسے گھسیٹ کر چھت پر لے گئی۔

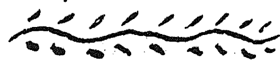
"وہ دیکھئے میری انگلی کی سیدھ میں باریک سا خوبصورت چاند ———"

اس نے فلک پر دیکھا ——— وہاں شاید سب کو چاند نظر آگیا مگر اس نے دیکھا یہ تو اس کی ٹوٹی ہوئی چوڑی ہے جو آسمان کی چھت پر ٹانک دی گئی۔

دفعتاً اس نے اپنی سونی کلائیوں پر نظر دوڑائی اور چاند کو دیکھا اداس چہرے پر سوگوار مسکراہٹ ابھر آئی۔ آنکھوں کے کنارے پر دو موتی چمکے ہوا کے جھونکے میں دل کی سرد آہ بھی شامل ہو گئی۔

دور کہیں ریڈیو پر گیت بج رہا تھا ———

"چاند پھر نکلا ——— مگر تم نہ آئے"



دستِ حنا

"جلتے ہوئے دیئوں کی لو پر تو پروانہ رقص کرتا ہے مگر بجھی ہوئی شمع کا طواف کرنا پرستش کا حسین انداز ہے۔ ہنسنے والے کے ساتھ تو زمانہ ہنستا ہے لیکن رونے والے کے آنسو پونچھنے کے لیے کوئی اپنا دامن آگے نہیں بڑھاتا۔ زندگی تو وہی ہے جو دوسروں کے کام آئے۔" شمع الفاظ کے موتی لٹا رہی تھی اور شمیم احمد آنسوؤں کی بوندیں برسا رہے تھے۔

دستِ حنا

"شمو باجی ...... شمو باجی ...... دیکھئے تو رما کی برات آئی ہے۔ چلئے نا۔! ہم بھی دیکھیں گے۔" نگار کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

وہ جنگل کی طرف کھلنے والی کھڑکی کی طرف منہ کیے کھڑی تھی۔ سُرخ دوپٹہ شانوں پر لہرا رہا تھا۔ ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی لانبی سی چوٹی پشت کے حسن کو دوبالا کر رہی تھی۔ نگار کی آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا۔ ایسے محسوس ہوا جیسے قوس و قزح کے سارے رنگ یکجا ہو گئے ہوں۔

"ارے چلو بھی ...... نگار اسے گھسیٹنے لگی۔

"آتی ہوں بابا ...... ذرا سنبھلنے تو دو" اس نے الجھی لٹ درست کرتے ہوئے کہا ۔۔۔۔!

"کیسے بتاؤ گی سنور کر، چلو نا جلدی!" نگار نے نادانی سے کہا۔ وہ عجلت میں تھی۔

"کیسے بتاؤ گی ___؟" جملہ دُہراتے جیسے کھو سی گئی۔

"کیا ہوا ___؟ کیا سوچ رہی ہو" نگار نے اسے جھنجھوڑا۔

"اوں ___ کچھ نہیں چلو چلیں۔" وہ پیر میں چپل ڈالے باہر نکل گئی۔

دونوں پھاٹک کی طرف نکلے۔ کپاؤنڈ کی دیوار کے سہارے کھڑے ہو کر رما کی برات دیکھنے لگیں۔ برقی قمقمے جگمگا رہے تھے۔ بینڈ بج رہا تھا۔ دُلہا پھولوں سے سجی گاڑی سے اترا۔ اس کے چہرے پر سہرے کی لڑیاں تھیں۔ نگار اچھل اچھل کر یہ تماشہ دیکھ رہی تھی۔ اور شمع تو بس شمعِ خاموش بنی کھڑی تھی۔ اس کی نظروں میں آج سے تین سال پہلے کا دور گھومنے لگا۔ اسے یاد آیا کہ وہ بھی دلہن بنی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں بھی مہندی کے گل بوٹے سجائے گئے تھے۔ گہنوں نے اسے سنوارا، سرخ کپڑوں نے اسے شعلوں کی طرح دہکا دیا بس کسی نے ہاتھ لگایا اور جل گیا۔ اس کی سہیلیاں اسے چھیڑ رہی تھیں وہ مسکراتی رہی جیسے پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہوں۔ دفعتاً ایک زلزلہ آ گیا۔ دلہا مسند سے اُٹھ گیا۔ سہرے کے پھول تڑپ کر رہ گئے۔ سرخ کپڑے تلملا گئے۔ اور دستِ حنا مرجھا گیا۔ ریاض نے عین نکاح کے وقت اس لیے انکار کر دیا کہ اسے اسکوٹر نہیں دی گئی جب کہ وہ کار کا آرزو مند تھا۔ شمع کے بابا نے منت سماجت کی، اپنا دامن پھیلایا لیکن اندھے گاہکوں نے اس ہیرے کو خریدنے سے انکار کر دیا۔ شمع دلہن تو بنی مگر سہاگن نہ بن سکی۔ بینڈ والوں نے بہت ہی پُر درد گیت چھیڑا۔

بابل کی دعائیں لیتی جا، جا تجھ کو سکھی سنسار ملے

میکے کی کبھی نہ یاد آئے سسرال میں اتنا پیار ملے

وہ اپنے خواب سے چونک گئی۔ اس کی نظر اپنے ہاتھوں کی طرف اٹھی جن کی گلابی رنگت حنا کو بھی شرما رہی تھی۔ خوب صورت ہتھیلیوں پر اُبھرا اُبھرا سا گوشت، لانبی لانبی مخروطی انگلیاں، کیا ان پر کبھی رنگِ حنا چڑھے گا۔؟ اس کے دماغ نے سرگوشی کی۔ اس نے اپنی مٹھیاں کس لیں۔

"چلو نگار اندر چلیں" اس نے نگار کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ برات جا چکی تھی۔ وہ دونوں اندر داخل ہوئیں۔

"میں پوچھتی ہوں، کہاں گئیں تھیں تم دونوں ——— ؟" اپنی چچی کی گرجدار آواز سے دہل گئی۔

"ممی رما کی برات آئی تھی نا! اسی لیے دیکھنے گئی تھی" نگار نے ماں کو سمجھایا۔

"برات رما کی تھی اور شوق تم دونوں کو چرایا دیکھنے کا! شرم تو کرو —! ایک تو ہماری جان پر عذاب بن کر بیٹھی ہو اور دوسرے یوں سڑک پر تماشہ بننے کیوں چلی جاتی ہو؟" چچی کی آواز تیز ہوتی جا رہی تھی۔

"چچی! ———" وہ ہلکا سا ہاتھ ان کی آواز کو روکنے کے لیے اٹھا کر رہ گئی۔

"چپ رہ کمبخت! ہمارا تو جینا دوبھر کر دیا ہے۔ کسی کے پاس جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ نہ جانے کس جنم جلی کو میرے پلے باندھ گئے مرنے والے۔ اگر آنکھ مٹکانے کا شوق ہے تو میرے گھر کے دروازے اپنے لیے بند سمجھو۔" چچی کا غصہ تھمتا ہی نہ تھا۔

"ممی! شمو باجی کو تو میں ہی لے کر گئی تھی۔ آپ ان پر کیوں بگڑ رہی ہیں۔" نگار نے مداخلت کی۔

"چل ہٹ! یہاں سے بڑی آئی شمو باجی کی طرف دار بن کر۔ یاد رکھو نگار اگر تم نے بھی دوسروں کی طرح اپنا قدم آگے بڑھانا شروع کیا۔ تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ نہ جانے کیا دیکھا تھا کسی نے جو مہندی لگ کر چھوٹ گئی ———" چچی تو اتنا کہہ کر اندر چلی گئیں اور شمع ساکت و جامد کھڑی ہو گئی۔ اک اک لفظ تازیانہ بن کر اس کے دل پر برستا رہا۔ آنسو اس کے گالوں کا صدقہ اتارتے رہے۔ اس کی سسکیاں فضا میں تیز

ہوگئیں۔ دفعتاً اس کے سر پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ اس کا بیمار چچا اس کے سامنے تھا۔

"نہ رو میری بچی!" چچا کے منھ سے مدھم سُروں میں نکلا۔

"چچا!" —— شمع کا سارا غم اس ایک لفظ پر لاوا بن کر بہہ نکلا — وہ بلک پڑی۔

"میں پوچھتی ہوں یہ ٹسوے کس کے لیے بہائے جا رہے ہیں۔ تمہیں کوئی اور کام نہیں؟ ہزار بار کہا اپنی چارپائی سنبھالو، مگر تم نے تو گھر کی ہر بات کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ ہر وقت مداخلت ہونہہ!" اس کی چچی نے اپنے شوہر پر بگڑتے ہوئے کہا۔

"بیگم! خدا سے ڈرو! کیوں یتیم کا دل دکھاتی ہو۔" بہ مشکل تمام وہ اتنا کہہ سکے۔

"بس بس! تمہاری تقریر کی مجھے ضرورت نہیں۔" وہ ہاتھ ہلاتی ہوئی یہ کہہ کر چلی گئیں۔ شمع اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

صبح کے نو بج رہے تھے وہ آفس جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ کپڑے بدل کر جب اس نے چچی سے جانے کی اجازت مانگی تو وہ فوراً کہہ اٹھی۔

"آج پہلی تاریخ ہے۔ خیال رہے کوئی مفت کی روٹیاں نہیں دیتا اس زمانے میں کمائی کھانے کے لیے ہوتی ہے سنورنے کے لیے نہیں!" وہ پھر ایک بار تلملا گئی۔ اس نے بالوں سے گلاب کا وہ پھول نکال کر پھینک دیا۔ جو نگار زبردستی لگا کر گئی تھی۔ وہ گیٹ سے باہر نکل گئی۔

"کاش بابا زندہ ہوتے ——" چلتے چلتے اس کے دل نے کہا۔ وہ سوچنے لگی —— اس کی زندگی نے کتنی بہاریں دیکھیں سب

کی سب خزاں بداماں تھی۔ پیدا ہوتے ہی ماں نے آنکھیں بند کیں، دلہن بنتے ہی باپ نے منھ پھیر لیا۔ بچپن ممتا کی تشنگی سے دوچار تو شباب شفقت سے محروم!

"شمع"! وہ اپنے نام کی گہرائی میں ڈوب گئی۔ جلنا اور سلگنا بس یہی دو کام ہیں اس کی زندگی کے! بس اسٹاپ آچکا تھا وہ بس میں سوار ہو گئی۔ ماضی کی دنیا پھر ایک بار اس کے سامنے آ گئی۔ اسے یاد آیا بابا کے مرنے کے بعد چچا نے کتنی اپنائیت سے اسے اپنے گھر لایا اور پہلی بار گھر میں قدم رکھتے ہی اسے چچی کی کرخت آواز سنائی دی "یہ گھر ہے کوئی یتیم خانہ نہیں جو ہر آنے جانے والے کو پناہ دے۔" اس کا دل بھر آیا اسے وہ دن بھی یاد تھا جب ایک صبح اس کا چچا آنگن میں بے ہوش پڑا تھا۔ ڈاکٹروں کی رائے یہ ہوئی کہ اس کے پیر مفلوج ہو چکے ہیں۔ چچا کی بیماری کے بعد اس نے نوکری سنبھالی۔ گھر کا سارا بار اب اسی کے سر تھا۔ وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر سوچنے لگی۔ کیا اس کی زندگی یوں ہی گذر جائے گی۔؟۔ دفعتاً اس کے خیالات کی ڈور ٹوٹ گئی۔ اس کی بازو والی سیٹ پہ بیٹھے ہوئے نوجوان نے اس کا گرا ہوا پرس اس کے حوالے کیا۔

"اوہ شکریہ!" وہ چونک اٹھی۔

"کوئی بات نہیں! آئندہ احتیاط کیجیے۔ جاگتے خواب خطرناک ہوتے ہیں۔" نوجوان نے کہا۔

"بیدار کرنے کا مکرر شکریہ" وہ سنجیدگی سے کہہ کر دوسری طرف دیکھنے لگی اس کا دایاں ہاتھ اس کے گالوں پر تھا۔

"آپ کہاں جائیں گی مس شمع"؟ نوجوان نے سوال کیا۔

"جی ——— آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا۔؟" وہ حیرانگی سے پوچھنے لگی۔

"ہم تو صورت دیکھ کر کہہ دیتے ہیں۔ دیکھیئے نا شمع تو بہت خوبصورت ہوتی ہے۔ لیکن جلتی رہتی ہے۔ ذرا سا ہاتھ لگایا اور بس آگ لگ گئی۔ میں نے ہمدردی جتائی اور آپ نے بے مروتی سے چہرہ پھیر لیا۔ آپ کی اس انگوٹھی نے مجھے چوری کی ترغیب دی۔" نوجوان نے اس کی دائیں ہاتھ کی انگلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ ——— !" اس نے اپنی انگلی دیکھی۔ انگوٹھی دیکھی۔ انگوٹھی پر شمع لکھا تھا۔

"آپ بہت دلچسپ ہیں!" اس نے مسکرا کر کہا۔

"معاف کیجئے میں نوید انجم ہوں۔ انڈین ایئر فورس میں کیپٹن ہوں۔ آج کل چھٹی پر ہوں۔ دل کے بہلانے کے لیے گھومتا رہتا ہوں۔ کبھی بس میں کبھی ٹرین میں کبھی پلین میں۔ نوید نے تعارف کروایا۔

"بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر! میں ترسیلی آفس میں اسٹینو ٹائپسٹ ہوں۔" شمع نے کہا۔

"لیکن آپ ٹائپسٹ کم اور معصوم قاتل زیادہ نظر آتی ہیں۔ معاف کیجئے میں ذرا صاف گو آدمی ہوں۔ آپ نے کبھی آئینہ دیکھا ہے؟ نوید اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"بڑے شریر ہیں آپ! تین سال بعد وہ پہلی بار کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ بس ایک جھٹکے سے رکی۔ اس کا آفس آچکا تھا وہ اتر پڑی۔

یہ تو تھی نوید اور شمع کی پہلی ملاقات۔ اس کے بعد یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ شمع کو نوید کی باتوں میں جینے کی راہ نظر آتی تھی۔ چاچی کی پھٹکار کے بعد نوید کے پُرخلوص جملے مرہم کا کام انجام دیتے۔ جیسے آگ بجھانے کے لیے

پا نی میسر آگیا ہو۔ وہ نوید کے بارے میں گھنٹوں سوچتی رہتی۔ نوید امیر باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اور وہ بن باپ کی بے کس بیٹی۔ کتنا بڑا تضاد تھا یہ ـــــ وہ جانتی تھی کہ نوید کی محبت کا رنگ اگر چہ اس کے دل پر چڑھ چکا ہے۔ لیکن اس کے سہاگ کی مہندی اس کے ہاتھوں پر کبھی چڑھ نہیں سکے گی۔ نوید کے الفاظ اسے بار بار یاد آتے۔ ایک دن اس نے شمع کا گداز ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا تھا

"ریاض نے جس حنا کو تمہارے روندے ہوئے ارمانوں کے خون سے رنگین بنایا ہے میں اسی حنا کو اپنی محبت کے رنگ میں شامل کر کے تمہاری ہتھیلیوں پر گل بوٹے سجاؤں گا۔ جس کی ہر پتی پر نوید لکھا ہو گا۔ تمہاری آنکھوں کے جلتے ہوئے دیئے اب تمناؤں کی مزاریں پر رکھے جائیں گے۔ تمہارے لبوں کے سکوت میں اضطراب نہ ہے میں اس کو نغموں میں بدل دوں گا۔ میں تمہاری زلفوں میں پناہ چاہتا ہوں۔ بالوں کا یہ سایہ میرے لیے وقف کر دو۔ آنسوؤں کا یہ ساغر مجھے دے دو۔ تمہاری زندگی کا سارا غم ان سرخ گالوں کا صدقہ اتارتے ہوئے میرے حوالے کر دو۔ میں اس شراب کو پی لوں گا۔ تمہارے غم کو اپنا لوں گا۔ اس کے بعد تم سورج کی پہلی کرن بن جاؤ گی۔ چمن کی پہلی بہار بن جاؤ گی۔ پھول کی خوشبو بن کر فضا کو معطر کر دو گی۔ میری زندگی کی طویل راہوں میں تمہیں ہم سفر بنانا چاہتا ہوں۔ ایک بار صرف ایک بار مجھے اپنا لو" ـــــ اور اس نے بے پناہ چاہت سے اس کے ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیے۔

پھر نوید کی چھٹیاں ختم ہو گئیں وہ رخصت ہو گیا۔ اس کے دامن میں ہزاروں امید کے دیئے جلا کر۔ وہ آنسوؤں کی بوندیں ٹپکا ٹپکا کر انھیں جلاتی رہی۔ دن گذرتے رہے اور لمحے سرکتے رہے۔ ایک طوفانی شام کو اس کے چاچا نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کرنے سے پہلے ایک بار اس کی آنکھوں میں گھور کر دیکھا اور کہا بیٹی! میں نے...

اس گھر میں .... تجھے لاکر .... کبھی سکھ نہ دے سکا .... کہانی صاحب کی .... آخری آرزو .... میری بھی آرزو .... بن گئی .... میں تجھے دلہن نہ بنا سکا .... مگر میری بچی تیرے ہاتھوں میں مہندی ضرور لگے گی۔ .... میری ایک خواہش ضرور پوری کرنا .... نگار کو وداع کرنے کے بعد .... اپنے ہاتھوں کو سنوارنا .... یہ فرض تیرے ہی ذمہ سونپ رہا ہوں!" جملہ ختم ہوتے ہی ان کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ چچی اور نگار کی دل خراش چیخوں نے ماحول کو لرزا دیا اور وہ .... مرنے والے سے بہت پہلے ہی مر چکی تھی۔ جو خود ہی زندہ لاش ہو وہ کسی کی موت پر کیا آنسو بہائے۔ اس نے تڑپتی ہوئی نگار کو سینہ سے چمٹا لیا۔ جیسے چچا سے کیا ہوا وعدہ نبھانے کا عہد پورا کر رہی ہو۔

دن گزرتے دیر نہیں لگتی۔ کسی کی موت سے زندگی کے کاروبار ختم نہیں جاتے کچھ ہی کیوں نہ ہو زندگی کی گاڑی ٹیڑھی میڑھی پٹریوں پر آگے ضرور بڑھتی ہے۔ شمع گھر کے افراد کو اپنی لو سے راستہ دکھا رہی تھی۔ چچا کا چھوڑا ہوا مکان انہیں کے علاج کے لیے لیے گئے قرض میں بندھ چکا تھا۔ گزر بسر کے لیے صرف شمع کی آمدنی کا سہارا کافی تھا۔ چچی کی طبیعت نے بھی عجیب موڑ لیا۔ شاید یہ قدرت کی کرشمہ سازی تھی کہ بگڑے ہوئے دنوں نے انھیں انسان بنا دیا۔ حالات کی ستم ظریفی، شوہر کی موت نوجوان لڑکی کی شادی کا مسئلہ، تنگئ معاش نے انھیں خوب خوب چرکے لگائے، اور بیدرد چچی کی جگہ ہمدرد چچی بن گئی۔ شمع کو دیکھے بغیر اب وہ رہ نہ سکتی تھی۔ شمع ان کی غیر معمولی تبدیلی پر حیران ضرور تھی۔ ساتھ ہی خوش بھی تھی کہ برسوں بعد ماں کی جگہ پر ہو رہی تھی۔ اتنی تنگی کے باوجود شمع نے نگار کی تعلیم برابر جاری رکھی۔ نگار کی عمر چڑھتے سورج کی تھی۔ دیکھتے دیکھتے شباب کی منزلوں میں آ چکی

تھی۔ نوید سے ملنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ کبھی کبھار وہ اس سے مل لیتی۔ ہر بار اس نے نوید کو یہ کہہ کر ٹالا کہ مجھے پانا ہے تو انتظار کی شمعیں جلائے رکھنا۔ تم جلد بازی سے کام لوگے تو مجھے کھونا پڑے گا۔ اور نوید شمع کے اس جملے پر ہار مان لیتا۔ وہ چاہتا تھا کہ شمع کی مالی طور پر امداد کرے۔ لیکن شمع خوددار لڑکی تھی۔ اس کی غیرت یہ گوارا نہ کرتی تھی کہ اس کا محبوب اس کی غریبی پر ترس کھا کر اسے قابلِ رحم سمجھے۔ نوکری کے ساتھ ساتھ وہ ٹیوشن بھی کرتی تھی۔ جہاں تک ممکن ہو وہ اپنے چچا کی آخری خواہش جلد سے جلد پوری کر دینا چاہتی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ نوید کی محبت میں کھو کر وہ اپنے فرض سے غافل ہو جائے گی۔ اس لیے اس نے دل پر پتھر رکھ لیا۔ اور نوید سے ملنا کم کر دیا۔ انھیں دنوں شمع کی کوششوں سے نگار کے لیے ایک اچھا رشتہ آیا اس کی چچی نے کہا۔

"شمع کی موجودگی میں نگار دلہن نہ بنے گی۔

"چچی جو کام بن رہا ہے بن جانے دو بگاڑو نہیں۔ شمع کے لیے نگار کا راستہ نہ روکئے آپ کو میری قسم۔ میں نے چچا سے وعدہ کیا ہے۔ اگر اسے پورا نہ کر سکی تو مجھے جینے کا حق نہیں ـــــ" شمع نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اس کی چچی چپ ہو گئیں۔

شمیم احمد کے لڑکے نسیم احمد کے لیے نگار کا رشتہ آیا تھا۔ لیکن لڑکی پسند کرنے کے باوجود ان لوگوں نے چند شرائط پیش کیں۔ جو ان سے پوری نہ ہو سکتی تھیں اس دن دفتر سے لوٹنے کے بعد شمع نے چچی سے پوچھا کہ لڑکے والوں نے کیا جواب دیا۔

"بیٹی یہ لوگ لمبی چوڑی شرطیں پیش کر رہے ہیں۔ بھلا ایسے مانگنے والوں کو ہم کیا دیں گے۔ چھوڑو انھیں۔ قسمت میں رہے گا تو کوئی نہ کوئی مل ہی

جائے گا۔" اس کی چچی نے جواب دیا۔

"نہیں چچی! ـــــ میں خود ان سے مل کر بات کروں گی۔ لڑکا بہت اچھا ہے۔ نگار خوش رہے گی۔ آپ فکر نہ کیجئے میں سب طے کر لوں گی۔ شمع نے کھانا چھوڑ دیا اور ہاتھ دھو کر کپڑے بدلنے چلی گئی۔ گھر سے نکل کر وہ سیدھے شمیم احمد کے گھر پہنچی۔ وہ برآمدے ہی میں بیٹھے تھے۔

"تسلیم!" شمع نے سر جھکا کر کہا۔

"جیتی رہو! کیا تم اختر الزماں کی بھتیجی ہو۔؟" انھوں نے چشمے کی اوٹ سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں ـــــ"

"آؤ آؤ بیٹھو۔ کہو کیسے آنا ہوا ـــــ انھوں نے اخبار میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"بات یہ ہے کہ آپ کے صاحبزادے نسیم احمد کی نسبت میری بہن کے لیے آئی ہے۔"

"لڑکی کو پسند کیا جا چکا ہے۔ لیکن شادی کی شرائط کی فہرست بہت طویل بتلائی گئی ہے۔" شمع نے کچھ رکتے جھجکتے بات کہہ دی۔

"ہاں ـــــ" انھوں نے ایک لمبی سی آواز نکال کر کہا۔

"آپ تو جانتے ہیں کہ چچا کے انتقال کے بعد ہمارے معاشی حالات پہلے کی طرح نہیں رہے۔ نگار کو ہم اپنی حیثیت کے مطابق ضرور دیں گے۔ لیکن ہماری مقدور سے زیادہ مانگ ہمارے لیے ناقابلِ تکمیل ہوگی۔" شمع نے کہا

"وہ تو صحیح ہے لیکن لین دین تو شادی میں چلتا ہی ہے۔ اور پھر میرے ایسے کتنے بچے ہیں۔ لے دے کے صرف دو ہی ہیں۔ جس میں ایک تو تم ہو نے

کے برابر ہے۔" کہتے کہتے وہ کچھ آبدیدہ ہو گئے۔

"کیوں" شمع نے سوال کیا۔

"میرا بڑا لڑکا اعجاز کینسر کا مریض ہے۔ شہر کے تمام ڈاکٹروں نے ناامیدی ظاہر کی ہے۔ اس بیماری سے وہ ذہنی طور پر بہت زیادہ مفلوج ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ شادی کے بعد اس کی دماغی حالت بدل جائے۔ اور وہ آپریشن کے قابل ہو جائے۔ لیکن اسے لڑکی کون دے گا۔ کتنی منتوں کے بعد خدا نے اسے دیا۔ لیکن قسمت کی کرم فرمائی کہ ایسے مہلک مرض کا شکار ہو گیا اس کی ماں یہ چاہتی ہے کہ نسیم کا بیاہ رچا کر اپنے ارمان نکال لے۔" شمیم احمد کہتے رہے۔ وہ سر جھکائے سنتی رہی۔ دفعتاً اس نے سر اٹھایا۔

"اگر انھیں شریکِ حیات مل جائے تو کیا وہ اچھے ہو جائیں گے۔؟"

شمع نے سوال کیا۔

"ڈاکٹروں کا تو یہی خیال ہے۔ ہو سکتا ہے رفیق زندگی کے ساتھ اس کے دکھ کا مداوا ہو جائے۔ اس کی ذہنی حالت سدھر جائے تو اس کا آپریشن کامیاب ہو گا۔" انھوں نے جواب دیا۔

"کیا آپ مجھے بہو بنا سکیں گے۔؟" شمع نے نظریں جھکا کر کہا۔

"کیا" شمیم احمد اپنی جگہ سے اچھل پڑے۔ "تت ۔۔۔۔
تم اس بیمار سے شادی کرو گی ۔؟" وہ کچھ حیرت سے اور کچھ خوشی کے ملے جلے جذبات پر قابو پاتے ہوئے بولے۔

"جی ـــــ" شمع نے ہلکا سا سر کو خم کر کے کہا۔

لیکن ۔۔۔۔ لیکن ۔۔۔۔ کیا تم سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کر رہی

ہو۔'' انھوں نے سوال کیا۔

''جی ہاں۔ اگر میری وجہ سے وہ ٹھیک ہو جائیں تو یہ میری خوش نصیبی ہو گی۔ شمع نے کہا۔

''بیٹی تم جانتی ہو وہ کینسر کا مریض ہے۔ آپریشن اس کی جان بھی لے سکتا ہے۔ تم کیوں اپنے آپ کو تباہی کی طرف لے جا رہی ہو۔؟ ان کی آنکھوں آنسو تھے۔

''تباہی ——— ؟ گھر آباد کرنا تباہی ہے؟ اگر میری قسمت میں سہاگن رہنا ہو تو وہ ضرور اچھے ہو جائیں گے۔ آپریشن کے ٹیبل سے بھی میری قسمت انھیں کھینچ لائے گی۔ جلتے ہوئے دیئوں کی لو پر تو ہر پروانہ ہی رقص کرتا ہے مگر بجھتی ہوئی شمع کا طواف کرنا پرستش کا حسین انداز ہے۔ ہنسنے والے کے ساتھ تو زمانہ ہنستا ہے۔ لیکن رونے والے کے آنسو پونچھنے کے لیے کوئی اپنا دامن آگے نہیں بڑھاتا۔ زندگی تو وہی ہے جو دوسروں کے کام آئے۔ شمع الفاظ کے موتی لٹا رہی تھی۔ اور شمیم احمد آنسوؤں کی بوندیں برسا رہے تھے۔۔

''میری بچی ——— اللہ تجھے سہاگن رکھے۔'' انھوں نے شمع کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

''دوسری صبح شمع کی چچی حیران تھی کہ اچانک ہی بغیر کسی جہیز اور لین دین کے شادی کے لیے کیسے راضی ہو گئے۔

''خدا جانے تم نے ان پر کیا جادو کر دیا ہے۔ وہ تو لڑکی کو زرد کپڑوں ہی میں لے جانے کو راضی ہو گئے!'' شمع کی چچی آٹا گوندھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''میں نے جادو نہیں کیا چچی۔ یہ تو نگار کی قسمت کا کرشمہ ہے۔۔''

وہ نوید کو خط پوسٹ کرنے جا رہی تھی۔ شادی کے دن قریب

اُر ہے تھے۔ شمع تیاریوں میں لگ گئی۔ اس نے اپنی حسب حیثیت نگار کو مناسب جہیز دیا۔ شادی سے چار دن پہلے شمیم احمد اس کے گھر پہنچے۔

"بیٹی! میں تم سے ایک درخواست کرتا ہوں!" انھوں نے کہا۔

"حکم دیجیے۔ میں کیا خدمت کر سکتی ہوں آپ کی؟" اس نے سیاہ دوپٹہ سر پر ڈال کر کہا۔

"اعجاز میرے ساتھ آیا ہے وہ تمھیں دیکھنا چاہتا ہے۔ بہت مشکل سے شادی کے لیے راضی ہوا ہے۔ کہتا ہے "کون ہے وہ مسیحا جو مجھے موت سے بچانے آیا ہے۔!" وہ بولے۔

"بلوائیے انھیں اندر ——" وہ اتنا کہہ کر بغل میں ہٹ گئی۔ شمیم احمد نے آواز دی اور وہ اندر داخل ہوا۔ دبلا پتلا سا نوجوان جس کے جسم کی ہڈیاں ابھر ابھر کر اپنا تعارف کرانا چاہتی تھی۔ آنکھوں کے حلقے اس کی قسمت کی سیاہی کا ماتم کر رہے تھی۔ اس کی نظروں کی اداسی ماحول کو بھی لرزا رہی تھی۔ اس نے شمع کو دیکھا۔

"بابا ——" کہیں آپ مذاق تو نہیں کر رہے ہیں۔؟" اس نے اپنے باپ سے پوچھا۔ کتنا کرب تھا اس کی آواز میں۔

"نہیں ——" شمع بول اٹھی۔ اس کا اٹھا ہوا ہاتھ اٹھا ہی رہا۔ اعجاز نے دیکھا خوب صورت گداز ہاتھ، لانبی مخروطی انگلیاں، جیسے سچ مچ مسیحا کی انگلیاں ہوں!۔

"کیا آپ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ——" وہ رک گیا۔

"جی —— میں نے جو کچھ کیا ہے سوچ سمجھ کر نہ کسی پر رحم کی بنا پر، نہ کسی طلب کی آرزو میں، اس نے نظریں نیچی کر کے جواب دیا۔

"شکریہ! دعا کروں گا کہ زندگی مجھ سے وفا کرے،" اعجاز کے چہرے

پر، زندگی کی ہلکی سی کرن نظر آئی۔ وہ باہر نکل گیا۔

شادی کا دن آیا۔ نگار دلہن بنی ستوری اپنے پیا کے گھر چلی گئی۔ بغیر کسی "مانگ" کے اس کی مانگ افشاں سے بھر گئی۔ یہ صرف شمع، اعجاز اور شمیم احمد ہی جانتے تھے کہ کس نے کیا دیا اور کس نے کیا لیا ہے؟ ——— اعجاز سیاہ رنگ کی شیروانی میں ملبوس، بالوں کو ڈھنگ سے سنوارے اپنے حسین سپنا کو دیکھتا رہا اور زندگی کی ساری خوشیاں اس کے دامن میں بھرنے کے خواب سجاتا رہا۔ برات چلی گئی گھر سونا ہو گیا۔ شمع اپنے کمرے میں چلی گئی۔ نوید کی یاد اسے آج رہ رہ کر تڑپاتی رہی وہ سوچنے لگی جب وہ اس کا خط دیکھے گا تو نہ جانے اسے کتنی بے وفا سمجھ لے۔ مگر شمع بے وفائی کرتی کہاں ہے۔ اسے چاہے محفل میں رکھ دو چاہے مزار پر خاموش سلگتی ہی رہتا ہے۔

رات بھیگ چکی تھی وہ بستر پر دراز ہو گئی۔

نگار کی شادی کو دس دن گزر گئے۔ اب اس کے امتحان کا وقت آ رہا تھا۔ اس کی بھیا خوش تھیں۔ انھیں حقیقت سے بے خبر رکھا گیا۔ بھری محفل میں شمع نے اعجاز کو قبول کیا۔ ہر آنسو نوید سے کیے گئے وعدوں کی لوٹتی ہوئی مالا کی طرح گر رہا تھا۔ وہ مجبور بھی تو تھی۔ اعجاز کو نہ اپنا لیتی تو نگار کی زندگی میں بہار کیسے آتی۔؟ ایک چھوٹی سی قربانی اس کے خاندان کے لیے خوشیوں کے پھول مہکا رہی تھی۔ اس نے اپنے کعبۂ دل کے لوٹنے کا غم نہ کیا۔ صبر کا پتھر سینہ سے لگائے حوادثِ زمانہ کے تیر کھانے کو تیار ہو گئی۔ ایک طرف اپنی بہن کی مانگ کو سجانے کی فکر دوسری طرف ایک بوڑھے باپ کی دم توڑتی ہوئی خواہش، تیسری جانب اعجاز کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو پار لگانے کا جذبہ۔ وہ بھنور میں پھنس چکی تھی۔ اس نے ڈوبنے ہی کو مقدر زندگی جانا۔

شادی کے بعد اعجاز نے شمع کے چہرے پر ہمیشہ پھول ہی کھلتے دیکھے ان مہکتی ہوئی بہاروں کے سائے میں اس کی زندگی چل رہی تھی۔ شمع تو مسیحائی کے لیے آئی تھی پھر وہ مسکراہٹ کے مرہم کی بجائے آنسوؤں کا زہر اپنی آنکھوں میں رکھتی تو اعجاز کے دل کا زخم کیسے مندمل ہو سکتا تھا۔

دن ہفتوں کا روپ بدل کر مہینوں میں بدل گئے۔ جیسے فلک کے گوشہ میں مسکراتا ہوا ہلال رفتہ رفتہ بدر کامل بن جاتا ہے۔ شمع اور اعجاز کی زندگی بھی چاندنی کی طرح نکھر آئی تھی۔ اعجاز کی ذہنی حالت بہت سنبھل چکی تھی۔ ڈاکٹر اس غیر معمولی تبدیلی پر حیران بھی تھے۔ اور خوش بھی۔ اس کے چہرے کی ہڈیاں اب گوشت سے پر ہونے لگی تھیں۔ آنکھوں کے گرد چھائے ہوئے سیاہ حلقے برس برس چکے تھے۔

ایک حسین شام کو باتوں ہی باتوں میں شمع نے اس سے پوچھا۔

"آپ آپریشن کب کروائیں گے ——— ؟"

"شمع تم نے بیٹھے بیٹھے یہ تیر کیوں پھینک دیا؟" وہ ایک دم مضطرب ہو گیا۔

"کیوں؟ کیا بُرا کیا میں نے؟ دیکھئے تو اب آپ کی صحت میں کافی تبدیلی آ گئی ہے۔ آپ کے لیے تو آپریشن ضروری ہے۔ ڈاکٹر ورما کہہ رہے تھے کہ آپریشن کے بعد آپ بالکل اچھے ہو جائیں گے۔" شمع نے کہا۔

"شمع میں جینا چاہتا ہوں۔ مجھے راہ میں لٹنے نہ دو" اس نے شدت جذبات سے شمع کے ہاتھ تھام لیے۔ آپ گھبرانے کیوں لگے! میری چاہت میری الفت آپ کو مجھ سے دور نہ لے جا سکے گی۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم ابھی راہ پر چل رہے ہیں۔ زندگی کی تمام تر رعنائیاں تو آپ کو آپریشن کے بعد ملیں گی۔

آپ کا آپریشن کامیاب ہو گا۔ آپ صحت مند ہو کر گھر لوٹیں گے۔ میں اس وقت دلہن بنوں گی۔ آرزوؤں کی مہندی ہاتھوں پر سجاؤں گی۔ تمناؤں کے زیور سے خود کو آراستہ کروں گی۔ مسرتوں کے چراغ جلاؤں گی۔ نگاہوں کو پھول بنا کر آپ کی راہ میں بچھاؤں گی۔ اور پھر ہم زندگی کے لمبے سفر کے لیے نکل پڑیں گے۔ شمع نے اس کے سینے سے لگ کر کہا۔

"شمع جھوٹے خوابوں کے جزیرے میں مجھے لے جانے کی کوشش نہ کرو۔ وہاں آہوں کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ میں زندگی کی حسین وادیوں کی سیر کرنا چاہتا ہوں" اعجاز نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔

"میرے سرتاج! میں آپ کو ہر خطرناک موڑ سے بچا لوں گی۔ آپ مایوس کیوں ہوتے ہیں۔ میری دعائیں آپ کے قدموں سے لپٹی ہوئی ہیں۔ کوئی کانٹا بھی آپ کو چبھ سکے گا۔ آپ ایسا خیال دل سے نکال دیجئے۔" اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"شمع نہ جانے بار بار میرا دل یہ کہتا ہے کہ میں آپریشن ٹیبل سے واپس نہ آسکوں گا۔" وہ کرب میں ڈوبی آواز میں بولا۔

"نہیں .... میرا سہاگ، میری امنگاں .... میری دست حنا یوں مٹنے کے لیے نہیں بنا۔ آپ میرے عزم کو تھام کر کھڑے ہو جائیے۔ زندگی کی یہ ڈوری دراز ہو جائے گی۔" شمع نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ اعجاز چپ ہو گیا۔

اس گفتگو کے بعد ڈاکٹر ورما سے مل کر شمع نے آپریشن کی تاریخ مقرر کر لی۔ ڈاکٹر ورما کو صرف یہی خدشہ تھا کہ آپریشن کے دوران دماغی حالت بگڑ نہ جائے

اگر اعجاز کی ذہنی حالت اثر انداز نہ ہوئی تو آپریشن کامیاب ہونے کے قوی امکانات ہیں۔ زندگی اور موت کی کشمکش جاری رہی

آپریشن تھیٹر پر سرخ رنگ کا بلب روشن تھا۔ دروازہ بند تھا۔ اندر زندگی اور موت کی کشمکش جاری تھی۔ شمع اور دیگر افراد آپریشن تھیٹر کے باہر موجود تھے۔ شمع بنچ پر بیٹھی تھی۔ اس کا ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے رکھا تھا یوں معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے کسی نے پیمانہ لبریز کر کے رکھ دیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں دور تک امید کے دیے جلتے دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی سانسوں میں آس کے پھولوں کی مہک تھی۔ وہ گھڑیال کی سوئیوں کی طرف دیکھتی ہوئی بیٹھی تھی۔ لمحے ایک ایک کر کے سرک رہے تھے۔ ٹک ٹک ـــــ ٹک ٹک ـ ـ ـ۔ گھڑیال کی آواز کے ساتھ اس کا دل بھی دھڑک رہا تھا۔ دفعتاً وہ اپنی چچی کی آواز پر چونک گئی۔

"بیٹی! شمع! تم سے ملنے کوئی نوید صاحب آئے ہیں۔ میرے گھر آئے تھے۔ میں نے اعجاز کی روداد سنائی تو وہ تم سے ملنے یہاں چلے آئے۔" شمع نے ٹھوڑی کے نیچے رکھا ہوا ہاتھ نکالا اور چچی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

میں نے انھیں اندر آنے کے لیے کہا تھا۔ لیکن وہ کہتے ہیں پہلے تم سے اجازت لے لوں۔ تب وہ آئیں گے۔" چچی نے کہا۔

میں ہی ملنے جاؤں گی ـــــ" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے آنچل سر پر ڈالا۔ اور بوجھل قدموں سے آگے بڑھنے لگی۔ دور ہاسپٹل کے گیٹ کے پاس نوید کھڑا نظر آیا۔ فوجی وردی میں ملبوس وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دونوں کے درمیان چند گز کا فاصلہ رہ گیا۔ لیکن وہ محسوس کر رہی تھی کہ یہ زمین و آسمان کا فاصلہ ہے ڈوبتی شام اور طلوع سحر کا فاصلہ ہے ـــــ

شمع ہلکے نیلے رنگ کی ساڑی میں لپٹی چلی آرہی تھی۔ جیسے سمندر کی تہہ میں چھپی ہوئی کوئی موج ہوا کے جھونکوں سے سطح پر ابھرتی دوبتی ہو۔ نوید کی نظریں اس پر مرکوز تھیں۔ اس کی رگوں کا سارا خون پلکوں پر جم گیا تھا۔ وہ قریب آچکی تھی۔

"آپ کب آئے ــــــــــ؟" اس نے نظریں اٹھائے بغیر پوچھا۔

"میں گیا ہی کہاں تھا شمع! اس پروانے کی طرح تمہارا ہی طواف کر رہا تھا۔ جرأت ہوتے ہی اپنی شمع پر نثار ہونے کے لیے آجاتا ہے!" نوید کی پلکوں سے ایک آنسو ٹپکا۔ زمین نے اسے جذب کرلیا۔ اس کے جملے میں چھپے ہوئے کرب کو شمع نے محسوس کیا۔

"آپ بھول رہے ہیں، میں ایک بیاہتا عورت ہوں" اس نے دل پر جبر کر کے کہہ ہی دیا۔

"میں جانتا ہوں۔ اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہاری مجبوری نے تمہیں سہاگ کا یہ روپ دیا۔ میں تم سے تمہاری بیاہی ہوئی زندگی کا حساب مانگنے نہیں آیا۔ صرف اعجاز کی کیفیت سن کر اظہارِ ہمدردی کرنے چلا آیا۔ تم اسے جذبۂ انسانیت سمجھو یا مختصر ملاقات کے لیے تقریب!" نوید اشکوں کے بہاؤ کو روک کر بولا۔

"نوید، زندگی نے ابتدا ہی سے کانٹے دیے ہیں۔ میں نادان تھی جو ایک پل کے بہار پر اپنا سب کچھ نچھاور کر بیٹھی۔ تم سے ملنے کے بعد میں یہ بھول چکی تھی کہ مجھے کچھ اور کام بھی باقی ہیں۔ زمانے کی ستائی ہوئی اپنوں کے ہاتھوں لٹی ہوئی کلی کی طرح تمہارے دامن میں آگری۔ تم نے مجھے سنبھالا۔ لیکن میں نے بھول کی اپنے ساتھ تمہیں بھی دکھ کے گہرے سمندر میں ڈبو دیا۔ میں تم سے بھیک مانگتی ہوں نوید مجھے معاف کر دینا۔ میرے وعدوں کو فریب کا نام نہ دو۔ اسے

ایک بے بس کی مجبوری سمجھ لو۔ آؤ دیکھو! میں آج زندگی اور موت کی کشمکش کا تماشہ دیکھ رہی ہوں۔ یہ ہاتھ جنہیں تم حنا کے رنگ سے سنوارنا چاہتے تھے۔ آج اُمید و بیم کے دامن کو تھامے ہوئے ہیں۔ میں نے اپنے سارے غم سہاگ کی بازی میں لگا دیے ہیں۔ ان کا آپریشن کامیاب ہوگا تو میری زندگی کا نیا سورج طلوع ہوگا۔ ورنہ ... ...۔" اس سے آگے وہ کہہ نہ سکی۔ الفاظ حلق تک آکر رک گئے۔ اور آنسو پلک تک آکر تھم گئے۔

"نہیں شمع! ایسا نہ کہو! تمہارا سہاگ ضرور سلامت رہے گا۔" نوید نے کہا۔

"چلو اس در پر چلو جہاں میری قسمت بننے والی ہے۔" شمع نوید کو ساتھ لے کر آگے بڑھی۔

آپریشن تھیٹر اب بھی بند تھا۔ سب کے سب ساکت و جامد کھڑے تھے۔ ہر ایک کے دل کی دھڑکن زندگی کا پیام چاہتی تھی۔ ٹک ٹک ... ... ٹک ٹک ... ... ٹک ٹک گھڑیال کی سوئیاں گردش کرتی رہیں۔ ڈیڑھ گھنٹہ گذر گیا۔ اور پھر کھٹ کی آواز پر شمع نے چونک کر دیکھا۔ ڈاکٹر ورما تھے وہ تولیے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے اس کے قریب پہنچے۔ ان کی سانس تیز چل رہی تھی۔ وہ شمع کے پاس آکر رک گئے۔

"ڈاکٹر! میرے انتظار کا معاوضہ ——" شمع نے نظریں اٹھا کر سوال کیا۔

"میڈم! آئی ایم ساری! مجھے دکھ ہے کہ میں انہیں نہ بچا سکا۔ دماغی شریانیں پھٹ جانے سے وہ ... ...۔" ڈاکٹر ورما رک گئے۔

"اتنے طویل انتظار کا اتنا مختصر جواب ڈاکٹر ——" شمع نے

کرب ناک آواز سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

" آئی ایم ساری!" وہ شمع کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

شمیم احمد نگار نسیم اور نوید کی سانسیں اکھڑ گئیں۔ دل دہل گئے۔ اور فضا میں بجلی کی تڑپ کی آواز ابھر آئی۔ یہ ان کی سسکیاں تھیں۔

شمع نے ایک نظر سب کو دیکھا اور پھر نوید کی طرف مڑ کر کہا۔

" آؤ نوید! میں تمہیں ان سے ملاؤں" اس نے کنکھیوں سے نوید کو تاکا۔

" شمع ہوش میں آؤ ——— " نوید نے اسے جھنجھوڑا۔

" چھوڑو مجھے۔ دیکھو میں دلہن بنوں گی۔ مجھے ان سے ملنا جو ہے

شمع نے اپنے قدم پیچھے ہٹا لیے۔ سر پر آنچل ڈالا اور آپریشن تھیٹر کی طرف بڑھ گئی۔ ٹیبل پر اعجاز زندگی کی آرزو لیے مر چکا تھا۔ سفید چادر اس کے چہرے پر ڈال دی گئی تھی۔ شمع آہستہ آہستہ ٹیبل کے قریب پہنچی پھر اس نے چادر ہٹائی۔ سرخ سرخ خون اعجاز کے چہرے اور گردن پر پھیلا ہوا تھا۔

" نہیں ——— " اس کی دلدوز چیخ نے فضا کو ہلا دیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے لاش کو تکنے لگی پھر اس نے اپنا ہاتھ اس سرخ خون پر رکھ دیا۔ اس کی ہتھیلی پر سرخ رنگ کے گل بوٹے بن گئے۔ اس نے ہاتھ اٹھایا۔ دیکھا۔ ہتھیلی پر خون کے دھبے تھے دفعتاً وہ پیچھے پلٹی اور نوید کے قریب پہنچی۔

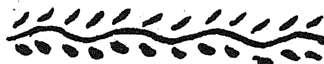
" دیکھو ——— دیکھو نوید ...... یہ میرا دست حنا ہے۔ کتنے خوب صورت گل ہیں ان میں۔ تم کہا کرتے تھے نا! حنا کے گل بوٹے سجا دو گے۔ دیکھو تو کتنے سارے پھول کھلے ہیں حنا کے! سرخ حنا کے! .....

ہاہاہا...... ہاہاہا!!" وہ بے تحاشہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔

"شمع! شمع!" نوید کے ساتھ سب اس کی طرف دوڑے مگر وہ مسلسل ہنس رہی تھی۔ اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ ڈاکٹر ورما بھی آچکے تھے۔ دو نرسوں نے مل کر شمع کو سنبھالا۔ مگر وہ مچل رہی تھی۔ ڈاکٹر ورما اس کے قریب پہنچے انھوں نے اسے غور سے دیکھا اور گردن کو خفیف سا جھٹکا دے کر مڑ گئے۔

"اس دکھ نے ان کے ہوش و حواس چھین لیے ہیں اپنا دماغی توازن کھو چکی ہے۔ سسٹر ایمرجینسی میں لے جاؤ۔ میں مینٹل ہاسپٹل کو فون کر کے گاڑی منگواتا ہوں۔ ڈاکٹر ورما یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ شمع دو نرسوں کے درمیان قہقہہ لگاتی چلی جا رہی تھی۔ جاتے جاتے اس نے عجیب نظروں سے نوید کو دیکھا۔ اپنا ہاتھ اس کے گال پر لگا دیا اور کہا۔

"دیکھو! یہ پھول ہیں! انھیں کھو نہ دینا۔ اور پھر بے تحاشہ ہنستی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ نوید نے سرخ خون کے دھبوں کو اپنی دستی سے صاف کیا۔ اسے آنکھوں سے لگایا اور عقیدت سے انھیں چوم لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ دور بہت دور سے شمع کے بھیانک قہقہوں کی آواز آرہی تھی۔



ٹکراؤ

تاریخ کے اوراق اُلٹتے گئے۔ خیر و شر کا ٹکراؤ۔ ہابیل و قابیل کا ٹکراؤ۔ اور اس کے بعد لامتناہی سلسلہ شروع ہوا۔ قبیلوں اور قوموں کا ٹکراؤ، رنگ و نسل کا ٹکراؤ، نظریات کا ٹکراؤ تہذیب کا ٹکراؤ، جنس کا ٹکراؤ، اقتدار کا ٹکراؤ

......" رشتوں کی پناہ گاہ کا نام ہی تو گھر ہے۔
جب رشتے باقی نہ رہیں تو پھر گھر کا وجود بے معنی سا لگتا ہے۔"

ٹکراؤ

اس نے کراہتے ہوئے کروٹ بدلی۔ زخم ابھی بھرے نہیں تھے۔ دو ریل گاڑیوں کے بھیانک ٹکراؤ سے رونما ہونے والے حادثے میں وہ معجزاتی طور پر بچ گئی۔ جب کہ اس کے خاندان کے دیگر تین افراد لقمہ اجل ہو گئے تھے۔ وہ خود بے ہوش ہو چکی تھی۔ جب آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ہسپتال میں پایا۔ پلنگ کے اطراف سفید یونیفارم میں ملبوس نرسیں اسے الف لیلوی داستان کی پریاں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس نے کچھ پوچھنا چاہا۔۔۔۔۔ مگر خواب آور انجکشن نے پھر ایک بار اس پر گہری نیند طاری کر دی۔

ایک ہفتہ بعد جب وہ ہوش میں آئی تو اس نے محسوس کیا کہ وہ صرف اس ٹکراؤ کو یاد رکھ پائی ہے۔ قدرتی طور پر وہ ایک باشعور ذہن رکھتی تھی۔ اس کے بیدار ذہن نے سوچ کا دھارا ٹکراؤ کی سمت موڑ دیا۔ اور وہ اول تا آخر تک ٹکراؤ کے فلسفے پر غور کرنے لگی۔

تاریخ کے اوراق الٹتے گئے ــــــ خیر و شر کا ٹکراؤ، ہابیل و قابیل کا ٹکراؤ، اور اس کے بعد لا متناہی سلسلہ شروع ہوا۔ قبیلوں اور قوموں کا ٹکراؤ، رنگ و نسل کا ٹکراؤ، نظریات کا ٹکراؤ، تہذیب کا ٹکراؤ، زبان کا ٹکراؤ، ہنر کا ٹکراؤ، اقتدار کا ٹکراؤ۔

اس نے پہلو بدلا تو ذہن نے بھی کروٹ لی۔ اب اخبار کی سرخیاں ایک کے بعد دیگرے اس کی نظروں سے گزرنے لگیں ــــ دو سیاروں کے درمیان ٹکراؤ۔ اس خبر پر

وہ ٹھٹھک گئی جانے کیوں اس کے پپڑی جمے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ آسمان پر ٹکراؤ، زمین پر ٹکراؤ، سمندر میں ٹکراؤ وہ ہنسنے لگی۔ آخر اماں کہاں لے گئی ——؟

پھر ایک بار اس کے ذہن نے جست لگائی۔ ٹکراؤ کے بھی دو پہلو ہوتے ہیں۔ مثبت اور منفی پتھروں کے درمیان ٹکراؤ کا نتیجہ آگ ہے۔ مرد و زن کے درمیان ٹکراؤ تخلیق کا سبب ہے۔ ذہنوں کا ٹکراؤ انقلاب لاتا ہے۔ سمجھوتے کا احساس ٹکراؤ کے بعد ہی تو جاگتا ہے۔ جنگ کے بعد امن کا۔ دشمنی کے بعد دوستی کا، بیماری کے بعد تندرستی کا، نفرت کے بعد محبت کا، بھوک کے بعد روٹی، اندھیرے کے بعد اُجالے کا۔ غلامی کے بعد آزادی کا، غربت کے بعد ثروت کا —— پھر لوگ اس مثبت پہلو کو کیوں نظرانداز کر دیتے ہیں۔ اگر ٹکراؤ کا یہی انداز رہا تو دنیا پاش پاش ہو جائے گی۔ زندگی کی دھجیاں بکھر جائیں گی۔ اس کی نظروں نے دیکھا بوسینا میں انسانیت کیسے پامال ہو رہی ہے۔ لاشوں کے انبار میں اقتدار کا ناگ پھن اٹھائے بیٹھا ہے۔ قتل و غارت گری، انسانی اعضا کا بکھراؤ، عصمت کی پامالی، درندگی کا ناچ، بیوگی کا راج، یتیمی کے پل صراط، کونپل پھوٹنے سے پہلے روندا جا رہا ہے۔

اس نے جھرجھری سی لی۔ ٹانکے ابھی تازہ ہی تھے درد کی ایک لہر اُبھری: مجھے یہاں کون لایا —— ؟" اس نے نرس سے سوال کیا۔

ایک انسان ——!" نرس نے مختصر سا جواب دیا مگر اس اختصار میں بڑی طوالت تھی پھر ایک بار وہ خیالات کے پنکھ لگائے اڑنے لگی۔

انسان —— کیا ہوتا ہے یہ انسان —— گوشت و پوست کا پیکر حواس خمسہ کا مجموعہ، پھر اس کی نظروں میں وہ منظر گھوم گیا۔ جب دو فرقوں کے درمیان ٹکراؤ ہوا تھا۔ وہ بھی تو انسان تھے جنہوں نے ایک دوسرے پر چاقو اور تلوار سے حملے کیے۔ ایک دوسرے کا خون بہایا۔ آگ لگائی۔ لوٹ مار مچائی آہ و بکا کا طوفان اٹھایا۔ مارنے والے

کبھی انسان ـــــــ مرنے والے کبھی انسان اس نے گردن جھٹک دی۔ زخم جیسے ہرے ہو گئے۔ کچھ دیر کے لیے اس پر جھنجھلاہٹ سی طاری ہو گئی۔ اس نے اپنی مٹھیاں کس لیں چہرے کا رنگ شفق میں ڈوب گیا اور ذہن میں ٹکراؤ۔ ٹکراؤ کی صدائیں گونجنے لگیں۔

وہ ایک جست میں بستر سے اٹھ بیٹھی۔ اس کے وارڈ کا دروازہ کھلا ایک ادھیڑ عمر کا شخص اندر داخل ہوا۔ چہرے پر آفتاب کی سی تمازت، ماہتاب کا اُجلاپن اور بہاروں کا نکھار، پتلون اور شرٹ میں ملبوس وہ اس کے قریب پہنچا۔ آنکھوں پر چشمہ چڑھا تھا۔ اندر سے اُلفت کے دو پیمانے چھلک رہے تھے۔

اب کیسی ہو بیٹی ـــــــ!!" آنے والے نے سوال کیا۔ اس مشفقانہ انداز پر اسے تسلی ہوئی۔ جواب میں اس نے گردن ہلا کر اشارہ کیا کہ وہ بہتر ہے۔

"گھر چلو گی ـــــــ!" اس شخص نے دوسرا سوال کیا۔ گھر کے نام پر وہ چونک اٹھی۔

امی، شوکت اور فرحین کے چہرے نظروں میں گھوم گئے۔ ٹرین کا ٹکراؤ اسے یاد آیا۔ اس کا اپنا اب کوئی گھر ہی نہیں تھا۔ رشتوں کی پناہ گاہ کا نام ہی تو گھر ہے۔ جب رشتے باقی نہ رہیں تو پھر گھر کا وجود بے معنی سا لگتا ہے۔

"کون سا گھر ـــــــ؟ اس کے لب ہلے

"اپنا گھر ـــــــ" اس شخص کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کے اجالے بکھر گئے

"اپنا ـــــــ" اس نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"ہاں اپنا ـــــــ تمہیں کچھ شک ہے ـــــــ؟" اس شخص کے لہجے میں بڑی گہرائی تھی۔

"آپ کون ہیں ـــــــ اس نے پوچھ ہی لیا ـــــــ

"ایک انسان ـــــــ" ترس والی بات دہرائی گئی۔

"اور میں ــــــ ؟ اس نے پھر دوسرا سوال کیا۔

"تم بھی ایک انسان ہو ــــــ" جواب ملا۔

اس کا ذہن پھر ایک بار قلابازیاں کھانے لگا۔ انسان اور انسان کا ٹکراؤ۔ اس کا انجام بھلا کیا ہو سکتا ہے۔

پھر اسے مندر و مسجد کا ٹکراؤ یاد آگیا۔

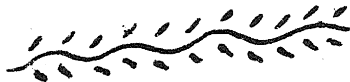
"مگر ــــــ مگر میں آپ کو نہیں جانتی ــــــ اس نے بے تعلقی سے کہا۔

"میں تمہیں اس وقت سے جانتا ہوں جب سے یہ دنیا بنی ہے۔" اس شخص کے جواب میں بڑا اطمینان تھا۔

وہ اجنبیت کے اس ٹکراؤ پر غور کرنے لگی۔ اس کے دل میں اپنائیت کا جذبہ بیدار ہوا شاید یہ اسی ٹکراؤ کا اثر تھا۔ وہ بستر سے اٹھ بیٹھی۔ صبح کا تازہ دم سورج بڑی شان سے اجالے بکھیر رہا تھا۔ اس کے ذہن سے اندھیروں کی پرت سرکتی محسوس ہوئی۔ وہ آہستہ آہستہ بالکونی کی طرف بڑھی۔ تاکہ اپنی گہری نیند کے سحر کو توڑے۔ بالکنی سے نیچے اس نے جھانکا۔ دور کچرے کے ڈھیر میں دو وجود کچھ تلاش کرتے نظر آئے۔ اس نے آنکھیں مل کر دیکھا ــــــ ایک انسان تھا اور دوسرا حیوان ــــــ بھلا یہ کیسا ٹکراؤ ہے۔ کوڑے کے اس انبار کے درمیان بھرپور کثافت کی موجودگی میں ایک شخص بڑے اطمینان سے ایک کتے کے ساتھ روٹی کھا رہا تھا۔ دونوں کے درمیان مکمل ہم آہنگی، صلح کل اور گمبھیر سمجھوتہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اس منظر کا بھرپور جائزہ لے رہی تھی۔ اس کے پورے حواس بیدار ہو چکے تھے۔

وہ گہری نیند سے جاگ چکی۔ سوچنے لگی جو روٹی دو انسانوں کے درمیان دشمنی کا سبب ہے وہی ایک جانور اور انسان کے بیچ دوستی بن سکتی ہے۔ ایک سوال اس کے ذہن نے کیا۔

انسان اور حیوان کے بیچ صلح، مفاہمت دوستی اور ہم آہنگی کا جذبہ تو پھر انسان اور انسان کے درمیان نفرت یہ عداوت کیوں ——— ؟ یہ ٹکراؤ کیوں ——
اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا وہی شخص اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بدستور قائم تھی۔ آنکھوں میں محبت کے دیے جل رہے تھے۔ جانے وہ کون سا جذبہ تھا جس کے زیر اثر وہ اس شخص کے سینے سے لگ گئی۔ اور اس کی آنکھوں میں امید کے اجالے بکھر گئے۔ شاید یہ انسان اور انسانیت کا ٹکراؤ تھا۔



کرچیاں

وہ غموں کے لشکر میں اکیلا و تنہا سپاہی تھا نہ جس
کی جبیں پُر خون تھی اور نہ جس کا جسم گھائل تھا۔ بیابانِ حیات
میں وہ مسکراہٹ کے پھول بکھیرتا آگے بڑھ رہا تھا۔ شورشِ
روزگار نے اسے پسپا نہیں کیا وہ ہر حملے کا جواب مسکراہٹ
سے دیتا تھا۔

کرچیاں

ھال اگرچہ وسیع بہت تھا۔ لیکن لوگوں کے ہجوم سے تنگیٔ داماں کا شکوہ کر رہا تھا۔ سبھی اپنی جگہ خاموش بیٹھے تھے۔ لیکن سرگوشیاں جاری تھیں یا پھر کبھی کسی کے کھانسنے یا کھنکھارنے کی آواز۔

شہر کے نامور ادیب، شاعر، صحافی اور دوست احباب کی کثیر تعداد تھی۔ ڈائس پر چند کرسیاں اور ایک بڑا سا میز تھا۔ اسٹیج کی دیوار پر ایک بینر لٹکا ہوا تھا جس پر جلی حروف میں کچھ الفاظ لکھے تھے۔

وہ بھی ہال میں داخل ہوا۔ ایک اچٹتی سی نگاہ سے اس نے سارے ماحول کا جائزہ لے لیا۔ سبھی اس کے اپنے یہاں موجود تھے۔ لیکن کوئی بھی اس کی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا۔ تبھی اس کی نظر کرسیوں کی پہلی قطار میں بیٹھی رابعہ اور فرحان پر پڑی۔ اس کے چہرے پر اداسی کا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ ہونٹوں پر تلخیٔ حیات کی وجہ پپڑیاں سی جم گئی تھیں۔ گالوں کی شفق غم کی سیاہی میں بدل گئی تھی۔ اور آنکھوں کے کنول مرجھا گئے تھے۔ وہ دکھ کی سیاہی میں ڈوبا ہوا ایک لفظ بن گئی تھی۔ اس کا دل تڑپ اٹھا۔ تیزی سے وہ اس کے قریب گیا۔ اور قبل اس کے کہ وہ کچھ کہتا خاموشی میں ابھرتی ایک آواز نے

اس کے قدم پکڑ لیے۔

"معزز حاضرین! آج ہم سب یہاں اکھٹا ہوئے ہیں مرحوم شکیب ریحان کو خراجِ عقیدت پیش کرنے۔ اگرچہ وہ آج ہم سب میں موجود نہیں مگر اس کی یادیں آج بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ وہ سادگی کا پیکر اور حسنِ اخلاق کا نمونہ تھا۔ اس کی مسکراہٹ زمانے بھر کی تلخیوں کا آسودہ عکس تھی۔ وہ ایک اچھا شاعر، حساس ادیب اور ذہین صحافی ہی نہیں بلکہ ایک سچے مثالی دوست بھی تھا۔ آج ہم سب اس کی یاد منانے آئے ہیں۔ سب سے پہلے میں مدعو کرتا ہوں جناب احسن نواز خاں صاحب کو جن کے ساتھ مرحوم نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا تھا۔"

اس اعلان کے ساتھ ہی احسن نواز خاں سیاہ شیروانی میں ملبوس، سنہری فریم کا چشمہ لگائے اسٹیج پر تشریف لائے۔ مائیک سنبھالا اور کھنکھار کر آواز صاف کی۔ سامعین پر ایک نگاہ ڈالی پھر مرحوم کی تعریف میں رطب اللسان ہوئے۔ آخری جملے ادا کرتے ہوئے ان کی آواز بھرا گئی۔ جیب سے دستی اور آنکھوں سے چشمہ نکالا۔ دو نمکین بوندوں کو اس میں جذب کر لیا اور واپس اپنی جگہ آکر بیٹھ گئے۔

وہ اس ماحول میں خود کو بڑی دیر سے اجنبی محسوس کر رہا تھا۔ ایک لفظ بھی اس کے پلے نہیں پڑ سکا۔ تبھی چند اور لوگ ڈائس پر آئے جن میں کچھ شاعر تھے کچھ ادیب اور کچھ مخلص دوست۔ ایک کے بعد دیگرے تقریریں ہوتی رہیں۔ وہ احمقوں کی طرح سارے ماحول کا جائزہ لیتا رہا۔ اسے بڑی اکتاہٹ سی ہو رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا آخر وہ کیوں ایسی غمزدہ محفل میں چلا آیا۔ جہاں دکھاوا ہی دکھاوا تھا۔ ایک لفظ بھی ایسا نہ تھا جو سچائی

کی زبان سے نکلا ہو۔ ورنہ سچائی تو خون کے آنسو رلادیتی ہے وہ اسی تذبذب کے عالم میں دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ مگر ایک مانوس سی آواز نے اسے چونکا دیا۔

شکیب ان دوستوں میں سے تھا جو دوستی کو اپنا ایمان سمجھتے ہیں بے غرض و بے نیاز، مخلص و بے مثال۔ زندگی کا زہر جس نے چپکے چپکے پی لیا اور کسی کو خبر بھی نہ ہوئی۔ کسی بوسیدہ دیوار کی طرح اس کا دل اندر ہی اندر بیٹھتا رہا۔ مگر اس کی پرسکون مسکراہٹ جینے کا راز سمجھاتی رہی۔ ہر تلخئ حیات کو اس نے بڑی شان بے نیازی سے جھیل لیا۔ کسی کے آگے دست سوال دراز نہ کیا۔ کسی کے احسانوں کا بوجھ اس نے نہیں اٹھایا۔ کسی کی لفظی ہمدردی کی طرف اس نے توجہ نہیں دی۔ وہ غموں کے لشکر میں اکیلا و تنہا سپاہی تھا نہ جس کی جبین پُر خون تھی اور نہ جس کا جسم گھائل تھا مسکراہٹ کے پھول بکھیرتا آگے بڑھ رہا تھا۔ شورش بیابانِ حیات میں وہ روزگار نے اسے پسپا نہیں کیا وہ ہر حملے کا جواب مسکراہٹ سے دیتا تھا۔ اس کی مسکراہٹ نے زندگی کو جیت لیا تھا۔ اور موت اس سے شرمندہ ہو گئی۔ اتنا کہتے کہتے مقرر کی آواز رندھ گئی اور آنکھیں آنسوؤں سے لبریز۔ وہ دوڑ کر اس کے قریب پہنچا کہ اسے گلے لگا لے کیوں کہ اس محفل میں اسی نے تو بیدردی کہا تھا۔ پھر اچانک ہی اس کی نظر رابعہ کی طرف اٹھ گئی۔ فرحان مچل رہا تھا اور وہ اسے بہلا رہی تھی ۔ صرف اس کے رونے کی آواز محفل کو مرتعش کر رہی تھی۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے ایک معصوم بچے کا اپنے باپ کے لیے خراج عقیدت ہو۔ اس کے آنسو یقیناً صاف اور شفاف تھے۔ جیسے آبپارہ موتی۔ تبھی کنوینر جلسہ نے اعلان کیا

جو رقم مرحوم کے نام فنڈ کی شکل میں جمع کی گئی ہے اسے اس کی بیوہ کے حوالے کیا جائے گا۔

اس اعلان کے ساتھ ہی رابعہ ننھے فرحان کو لیے اسٹیج کی طرف بڑھی۔ اس کا دل چاہا وہ دوڑ کر رابعہ کے قریب جائے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسٹیج سے اتار دے مگر بھری محفل میں وہ یہ بھی نہ کر سکا۔ تلخ گھونٹ پی کر اس نے ایک افسردہ سی نگاہ اٹھائی۔

رابعہ اب اسٹیج پر تھی صدر جلسہ نے پندرہ ہزار روپیوں کا ایک چیک رابعہ کے حوالے کیا۔ رابعہ نے ہاتھ بڑھا کر وہ چیک لیا۔ الٹا پلٹ کر اسے دیکھا اور مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔

"اگر مجھے اجازت دی جائے تو میں آپ سے کچھ کہنا چاہوں گی۔" کانپتے ہونٹوں سے لرزتے جملے اس نے ادا کیے۔ لوگ یوں خوفزدہ ہو گئے جیسے کسی نے ہال میں بم رکھنے کی اطلاع دی ہو۔ رابعہ نے فرحان کو اپنے بھائی کے حوالے کیا اور خود مائک کے قریب چلی آئی۔

حاضرین جلسہ پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر اس کی جانب دیکھا۔ ایک پل کے لیے وہ بھی دوڑ کر اس کے قریب چلا آیا۔ دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے میں جیسے پیوست ہو گئیں اور پھر رابعہ کے لب کھل گئے۔

"محترم صدر جلسہ! حاضرین کرام! آپ سب نے جس انداز میں میرے مرحوم شوہر کو خراج عقیدت پیش کر کے اپنے خلوص کا اظہار کیا ہے۔ اس کے لیے میں ممنون و مشکور ہوں۔ مجھے آپ سے کچھ عرض کرنا ہے۔"

ہال میں سناٹا پھر ایکبار چھا گیا۔ سبھی ہمہ تن گوش ہو گئے۔

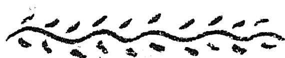
"یہ کاغذ جو میرے ہاتھ میں ہے اس کی قیمت پندرہ ہزار روپیے ہے۔ یوں سمجھیے کہ زندگی کے گال پر ایک بھرپور طمانچہ ہے کیوں کہ وہ زندگی جس نے کاغذ کے ان پرزوں کے لیے خودداری نہیں بیچی۔ اپنا دستِ سوال نہیں کیا تو کیا آج اس کی موت نے یہ خودداری خرید لی ——"

"نہیں —— ہرگز نہیں میں ایک خوددار انسان کی بیوی ہوں جس نے اپنی محنت پر اپنا حق اور اپنی مصیبت کو اپنا مقدر سمجھا میں منتظمین جلسہ سے درخواست کرتی ہوں کہ وہ اس رقم کو کسی یتیم خانے میں دے دیں۔ اور میرے لیے اپنی گزر بسر کی خاطر کسی روزگار کی فراہمی کر دیں۔ قدر انسان کی زندگی میں ہونی چاہیے موت کے بعد یہ حسین خراجِ نذر کی شکل میں ملے اس سے بڑھ کر زندگی کی شکست اور کیا ہو گی ——"

اس نے چیک صدرِ جلسہ کے حوالے کیا اور خود ڈائس سے اتر گئی۔

وہ اس کے روبرو کھڑا ہو گیا۔ تابناک مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے رابعہ اس سے لپٹ گئی۔ ایک زندہ پیکر نے مردہ پیکر میں جان ڈال دی موت جیت کر بھی ہار گئی۔ زندگی مٹ کر بھی ان مٹ رہی اور پھر وہ اپنی مخصوص مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے ہال کے باہر نکل گیا۔ یہ تو وہی تھا جس کے لیے یہ اہتمام کیا گیا تھا شکیب ریحان ——

جو مر چکا تھا دنیا کے لیے مگر زندہ رہا اصول کی طرح رابعہ کے لیے ایک آئینہ کی طرح جو اگرچہ ٹوٹ چکا تھا مگر جس کی کرچیاں احساسات میں پیوست ہو رہی تھیں۔



ویران ہے میکدہ

"شب میں تلاش سحر! یہ کیسے ممکن ہے۔" اس کا جواب آیا۔

"دل کو جلا کر ہم سحر کو پائیں گے۔" میں نے کہا۔

"اور جو سحر اجالا نہ دے سکے تب ——— ؟!"

"یاد کو شمع بنا کر نقش قدم ڈھونڈ لیں گے۔"

"اور جو نقش قدم نہ ملے تب ——— ؟"

"تب تو ہر ذرہ قابل پرستش رہے گا۔ کیا پتہ کس جگہ نقش پا رکھا ہو۔"

"اس لاحاصل تلاش کا مقصد ——— ؟"

"محبت، پیار، وفا اور پھر قربانی۔"

ویراں ہے میکدہ

میں نے کال بیل پر انگلی رکھی اور چند ہی لمحوں بعد اندر سے ایک مترنم سی آواز آئی۔ "اندر آئیے۔" میں نے دروازہ ہلکے سے ڈھکیل دیا۔ اب میں ایک آراستہ ڈرائینگ روم میں تھا۔ خوشنما پردے شاندار صوفہ سیٹ دیواروں کے کناروں پر رکھے بڑے بڑے گلدان، دبیز قالین، چھت پر لٹکتا ہوا فانوس جو ہوا کے جھونکوں پر جلترنگ بجا رہا تھا دیوار پر ایک جانب مرزا غالب کی قدآدم تصویر، دوسری جانب عمر خیام کی رباعی تصویر کے ساتھ تھی۔ اور کھڑکی کے اوپری حصہ پر ایک خوب صورت پینٹنگ۔ ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا یہ جنت ارضی ہے اور نہ جانے میں کہاں کھو گیا۔ ایک رس گھولنے والی آواز نے مجھے تصور سے حقیقت کی دہلیز پر لا کھڑا کیا۔

"تشریف رکھیے۔" اب میں نے جو نظر ڈالی تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ مرزا غالب کا دیوان، عمر خیام کی رباعی، مصور کی پینٹنگ جیسے ایک پیکر میں ڈھل گئی۔ سراپا گلشن ہی گلشن، زلفیں کاندھوں پر جھکی ہوئیں، گلابی دوپٹہ فرش کو چھوتا ہوا اس کے گلابی قدموں پر بچھا در ہو رہا تھا۔ سنگِ مرمر پر گلاب کی دو کلیاں ان کے درمیان موتیوں کی قطار، ستواں سی ناک میں جگمگاتی ہیرے کی کیل، شفاف پیشانی پر اُلجھی ہوئی شریر لٹ اور ان سب سے زیادہ متاثر کرنے والے دو

بڑے بڑے پیمانے جن میں گلابی ڈورے پڑے تھے۔ میکدہ ہی میکدہ تھی وہ آنکھیں۔ میں ان میکدوں میں جیسے ڈوب سا گیا۔

"فرمایئے۔" سمندر کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔

"مم ..... میں آفتاب ہوں۔" میں بڑی مشکل سے کہہ سکا۔

"جانتی ہوں ـــ"

"سحر سے ملنے آفتاب ہی آسکتا ہے۔" وہ مسکرا پڑی۔

"جی ـــ میں سمجھ نہ پایا۔

ڈیڈی نے مجھے بتایا تھا کہ آپ آنے والے ہیں۔

"اوہ ـــ" میں نے لمبی سانس لی۔ میں جلد آنا چاہتا تھا مگر....

بس نہ مل سکی" اُس نے جملہ مکمل کر دیا۔ اور میں ان میکدوں کے جام پینے لگا۔

"منی۔ چائے لے آنا۔ اُس نے آواز دی

"اس تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو دراصل اس اگریمنٹ کو آپ کے حوالے کرنے آیا تھا۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے اسے ٹیبل پر رکھ دیجئے۔ غالباً آپ نے تمام شرائط پڑھ لی ہوں گی۔" وہ دوپٹے کو اپنی انگلیوں پر لپیٹتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"جی ......جی ہاں۔" میرا حلق تر ہو رہا تھا اور میں جانے کیوں لڑکھڑانے لگا۔

"مجھے اُمید ہے کہ آپ دوسرے کرایہ داروں کی طرح تنگ کریں گے۔

ڈیڈی تو کرایہ دار ایسا چاہتے ہیں جیسے کہ اپنا ہی کوئی ہو۔ مگر لوگ اس کا غلط مطلب نکال لیتے ہیں۔ کبھی آئے دن کی فرمائشیں، وقت پر کرایہ کی ادائیگی سے تامل، بے ضرورت

لائٹ اور نل کا خرچہ، آدھی آدھی رات کو بے وجہ گانا، فون کے لیے بار بار کھٹکے مارتا بہرکیف ڈیڈی تو مکان کرایے پر دینا بھی نہیں چاہتے تھے ہمارے اصرار پر دو سال بعد اب یہ آپ کے حوالے ہوا ہے۔ اس روم سے ملحقہ کمرہ ہی آپ کو دیا جا رہا ہے تاکہ گھر کا بٹوارہ نہ ہو، یکسانیت بحال رہے۔" وہ کہہ رہی تھی اور میں ایک رند بے پرواہ کی طرح در میکدہ پر بڑھا جا رہا تھا۔ دفعتاً چائے کی پیالی کی کھنکھناہٹ نے مجھے چونکا دیا۔

"لیجیے چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" اس نے کہا۔

"اور آپ ــــــ" میں نے منی کے ہاتھ سے پیالی لیتے ہوئے کہا۔

"شکریہ" میں پی چکی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھی اور میں چائے پی رہا تھا۔ گویا شراب دو آتشہ کا مزہ لے رہا تھا۔

"منی صاحب کو ان کا کمرہ دکھاؤ اور سامان رکھوا دینا۔" اس نے منی کو آواز دی۔ اور میں چائے کی پیالی رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

مجھے اس گھر میں آئے پورا ایک ہفتہ گذر چکا تھا لیکن اس مدت میں صرف ایک بار مجھے اس کے دیدار نصیب ہوئے اور وہ بھی اس وقت جب وہ اپنے گھر کے کھلے آنگن میں بال سکھا رہی تھی۔ چمکیلی دھوپ میں زلفوں کے یہ سرمئی بادل میرے دل پر برس برس گئے۔ میں اس کی ملازمہ منی کو ہموار کرنے کی کوشش میں تھا کہ اس تک رسائی ہو سکے۔ کیوں کہ منی ہمہ وقت اسی کے ساتھ رہتی۔ خاں صاحب صبح سویرے جاتے اور رات دیر گئے لوٹتے۔ تب تک وہ اور منی دونوں ہی اکیلے رہتے۔

ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ میں باہر جانے کی غرض سے تیار ہوا اور سیدھے منی کے پاس چلا آیا۔

"منی تمہاری بی بی جی کہاں ہیں۔ انھیں یہ چابیاں دینی ہے۔" میں نے بہانا تراشا۔

"آئیے ــــــ" وہ مجھے اپنے ساتھ اس کے کمرے میں لے آئی۔ وہ بستر پر دراز تھی سیاہ ریشمیں زلفیں تکیئے پر بکھری ہوئی تھیں۔ ہلکے نیلے رنگ کے نائٹ گون میں وہ کوئی اپسرا لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں ٹیپ ریکارڈ بج رہا تھا جگجیت سنگھ کی مخصوص آواز فضا میں رس گھول رہی تھی۔

ٹکرا ہی گئی میری نظر ان کی نظر سے
دھونا ہی پڑا ہاتھ مجھے قلب و جگر سے

میں اس آواز اور حسین منظر کے طلسم میں کھو کر "واہ" کہہ اٹھا اس کی بند آنکھیں کھل گئیں اور میرے لبوں سے بے ساختہ یہ شعر مچل گیا۔

کون اٹھا یہ آنکھیں مل کے
جھیل میں کھل گئے پھول کنول کے

"آپ" میری آواز پر وہ اُٹھ بیٹھی" اس نے ٹیپ بند کر دیا۔

"شاعری اور موسیقی سے شاید آپ کو بھی لگاؤ ہے" ۔ اس نے پوچھا۔

" فطرتاً حسن پرست ہوں اچھی شئے کو دیکھ کر اچھے شعر پڑھ لیتا ہوں اور موسیقی سے مجھے پیار ہے۔"

"اور تشریف رکھیئے۔ کہیئے کیسے آنا ہوا۔" اس نے بال یکجا کرتے ہوئے کہا۔

"میں باہر جا رہا ہوں سوچا کمرے کی چابی آپ کے حوالے کرتا جاؤں۔"

"کسی پر اتنا اعتبار ٹھیک نہیں ــــــ" وہ مسکرا کر مجھے دیکھے جا رہی تھی اور مجھے واعظ کی توبہ توڑنے والی بات یاد آگئی۔

"اعتبار پر تو زندگی چلتی ہے مس۔۔۔۔۔" میں رک گیا میں اس کے نام سے ناواقف تھا۔

"مجھے سحر کہتے ہیں۔" جانے کیوں ایک سرد آہ گلابی کلیوں پر لرز کر رہ گئی۔

"آپ تنہا رہتی ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں تو ـــــ ڈیڈی اور ممّی میرے ساتھ رہتے ہیں۔ ڈیڈی کہیں باہر چلے جاتے ہیں تو میں اکیلا پن محسوس کرتی ہوں، یہ ٹیپ ریکارڈ، یہ کتابیں میری مونس و دمساز ہیں۔"

"آپ کو مطالعہ کا شوق ہے ـــــ؟" میں نے سوال کیا۔

"مطالعہ کا ـــــ" وہ رک گئی پھر کہہ اٹھی۔ "ہاں ممّی مجھے سناتی ہے مجھے صرف سننے کا شوق ہے پڑھنے کا نہیں ہے نا۔ ممّی۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں بی بی جی۔ آپ صاحب سے بات کیجئے میں کافی لے آتی ہوں۔"

جانے کیوں ممّی اداس ہو کر اٹھ گئی۔ مجھے تو بیٹھنے کا موقع ہی ہاتھ آیا۔

"آپ چاہیں تو میں آپ کو ہر روز اچھی کتابیں لادوں گا۔"

"میں نے کہا نا مجھے سننا پسند ہے پڑھنا نہیں۔" اس نے آنکھیں بند کر کے کہا۔

"کیا میں آپ کو سناتا رہوں تو آپ سننا گوارا کریں گی۔" میں نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

"جی ـــ جی ہاں" وہ کہہ اٹھی۔

"تو سنئے۔ گستاخی نہ ہو تو ایک شعر نذرِ خدمت کروں۔" میں خوشی سے جھوم اٹھا۔ حسن کی یہ التفات میرے لیے گوہرِ نایاب تھی۔ اس نے بڑے دلکش

انداز سے سر کو جنبش دی اور میرے لب کھلے۔

ہم نے پالا مدتوں پہلو میں ہم کچھ بھی نہیں
تم نے دیکھا اک نظر اور دل تمہارا ہو گیا

اُس کے پلکوں کی چلمن جھلملانے لگی۔

"شعر اچھا تھا۔" اُس نے کہا۔

"لیجئے ایک اور عرض ہے۔

تیری آنکھیں بھی مانگتی ہیں شراب
میکدے خود بھی جام پیتے ہیں!

اس بار میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں تاکہ اپنے لیے اقرارِ محبت دیکھ سکوں مگر اس نے نظریں جھکا لیں اور بے ساختہ کہہ اُٹھا۔

کافر تیری آنکھیں ہیں مئے حسن سے مخمور
تھوڑی سی محبت کی شراب اور پلا دے

اس عرصے میں منی کافی لا چکی تھی اور بات وہیں کی وہیں رہ گئی۔ میں کافی پی کر باہر نکل گیا۔

اب یہ میرا روز کا معمول تھا میں اسے کتابیں لا کر دیتا۔ ایک دن ہمت کر کے میں نے ایک پرچہ اس کتاب میں رکھ دیا اور جواب کا بے چینی سے منتظر رہا مگر جواب نہ آیا۔ میں نے ہمت نہ ہاری ہر کتاب میں نامۂ محبت بھیجتا رہا۔ ایک شام عجیب حادثہ ہو گیا۔ شام سے ہی گھٹائیں گھر کے آ رہی تھیں۔ ہوائیں تیز تیز چل رہی تھیں۔ ہلکی سی بوندا باندی تھی۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ سرمئی اندھیرا پھیل رہا تھا۔ تبھی تیز ہوا کے ساتھ بارش کا زور شروع ہو گیا۔ کمرے کی لائٹ بند ہو گئی اور جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ میں منی سے موم بتی مانگنے

اندر چلا گیا۔ کمرے سے چند قدم آگے بڑھتے ہی میں جیسے پھولوں کے کسی کنج میں کھو گیا۔ عجیب مدہوش کن خوشبو تھی پھر جیسے برقی رو کا جھٹکا مجھے لگا۔ چند ریشمی زلفوں کا آبشار میرے شانوں پر گرتا ہوا محسوس ہوا اور میرا ہاتھ گوشت پوست کے مجسمے سے ٹکرا گیا۔

"کون ـــــ؟" اندھیرے میں سہمی ہوئی آواز میں پہچان گیا۔

"میں ہوں ـــــ" میرے منھ سے دبی ہوئی آواز آئی۔ سناٹے میں دل کی دھڑکن بڑھ چکی تھی۔ دفعتاً بادل گرج اٹھا اور وہ مجھ سے بے اختیار لپٹ گئی۔ چند لمحے یونہی گذر گئے۔ پھر اندھیرے میں ہی ممتی کی آواز آئی۔

"بی بی جی وہیں ٹھہریئے' میں ٹارچ لا رہی ہوں۔ بڑا اندھیرا ہے۔ اس آواز پر میں چونک گیا۔

"لائٹ کب گئی ـــــ؟" اس نے دھیمے سروں میں مجھ سے پوچھا۔

"بس کچھ ہی دیر پہلے۔ لیکن اس اندھیرے میں آپ کا وجود کسی نور سے کم نہیں۔ بے اختیار میں نے کہا۔

"شب میں تلاشِ سحر ـــــ یہ کیسے ممکن ہے۔" اس کا جواب آیا۔

"دل کو جلا کر ہم سحر کو پائیں گے۔" میں نے کہا۔

"اور جو سحر اُجالا نہ دے سکے تب ـــــ؟

"یاد کو شمع بنا کر نقشِ قدم ڈھونڈ لیں گے۔

"اور جو نقشِ قدم نہ ملے تب ـــــ؟"

"تب تو ہر ذرہ قابلِ پرستش رہے گا۔ کیا پتہ کس جگہ نقشِ یار رکھا ہو۔"

"اس لاحاصل تلاش کا مقصد ـــــ؟

"محبت، پیار، وفا اور پھر قربانی۔"

"راہ کٹھن ہے منزل دور ہے۔ تنگئی وقت کا رونا بھی ہے کیسے آگے بڑھا جائے گا۔"

"حوصلہ اور امید پیار کی ناؤ کے پتوار ہیں۔"

"کہیں طوفان گھیرے پھر ــــــ ؟"

"پھر تو ـــــ پھر تو یہی کہیں گے ؎

یہی بہت ہے کہ تم دیکھتے ہو ساحل سے
سفینہ ڈوب رہا ہو تو کوئی بات نہیں

"یہ صرف وعدۂ باطل ہے۔" مغموم سی آواز اس کے لبوں پر آئی۔

"آزمالو ــ" میں نے اندھیرے میں ہی اس کا ہاتھ تھاما۔

"حقیقت کا سامنا نہ کر پاؤ گے۔"

"جذبۂ ہمت مجھ میں پنہاں ہے۔"

"لیکن سچائی بڑی تلخ ہے۔ تمہارا حسین تخیل شاید اس آئینے سے ٹکرا کر چور چور ہو جائے۔"

"لہولہان ہو کر بھی مسکراؤں گا۔"

"بعض لمحات زندگی میں ایسے بھی آتے ہیں جب انسان کو دل سے نہیں دماغ سے کام لینا پڑتا ہے۔"

"ہر صورت میں فیصلہ وہی رہے گا۔"

"جاننا چاہو گے سچائی کیا ہے۔" اس نے سوال کیا۔

"ہاں ــ" میں نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

"تو پھر میری سالگرہ کا انتظار کرو۔" اس کا جملہ پورا بھی نہ ہونے پایا کہ جائے آ گئی۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ممی بھی آ چکی تھی۔ بات آئی گئی ہو گئی اور

جب میں اپنے کمرے کو واپس جا رہا تھا تب میں نے روشنی کے سایوں میں میکدوں سے جام چھلکتے دیکھا۔

آخرکار وہ دن آ ہی گیا جب میرا امتحان تھا میں نے اس کی سالگرہ پر دینے کے لیے ایک بے حد حسین پینٹنگ خریدی تھی۔ ساقی جام و مینا اور رند بلانوش کا عکس تھا اس کے نیچے چند اشعار تھے۔

پارٹی شروع ہو چکی تھی ڈرائینگ روم مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں دروازے کے قریب ہی اپنا تحفہ ہاتھوں میں لیے خاں صاحب کے پاس کھڑا تھا۔ جان محفل کا سب کو انتظار تھا۔ ستاروں کی اس انجمن میں ماہتاب ابھی جلوہ گر نہیں ہوا تھا۔ میرا اضطراب بڑھ رہا تھا بے چینیوں نے سر ابھارنا شروع کیا۔ دھیمے سروں میں ٹیپ بج رہا تھا۔ مہدی حسن کی آواز فضا کو گرما رہی تھی ؎

بہت خوب صورت ہے میرا صنم
خدا ایسے مکھڑے بناتا ہے کم

اور — اور پھر جیسے شعلہ سا لپک گیا۔ بجلی سی کوند گئی۔ طوفان سا اٹھ گیا — گھپ اندھیرے میں ستارہ چمک اٹھا۔ گلاب کی بند کلیاں ایک ساتھ چٹک گئیں وہ آ گئی تھی۔ شفق کے رنگ میں ڈوبی ساری پہنے جیسے طلوع سحر اور ڈوبتی شام کا حسن سمٹ کر اس کے پیکر میں ڈھل گیا ہو، کاندھوں پر جھکی زلفیں ناگ بنی اس کی محافظ تھیں۔ ہونٹوں پر لالی اور آنکھیں — بس۔ شاید قدرت نے بڑے اطمینان سے انھیں بنایا تھا۔ بادام سے اس کی تراش، نرگس سے نیم خوابی شراب سے مستی، بجلی سے تڑپ، ستاروں سے ضیا، شب سے سیاہی، سحر سے اجالا، جیسے زندگی ہی زندگی۔ میکدہ ہی میکدہ تھیں وہ آنکھیں۔ محفل میں مبارکباد کا شور مچ گیا اور وہ مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ میں فاتحانہ انداز میں آگے بڑھا۔

خاں صاحب اس کے قریب پہنچے۔ ٹیبل پر ایک بڑا سا کیک رکھا تھا۔ خاں صاحب نے قریب جا کر اس کا ایک بازو تھاما۔ منی دوسری جانب اس کا بازو تھامے کھڑی تھی۔ دونوں آگے بڑھے۔ میرے بڑھتے ہوئے قدم ٹھٹھک گئے۔ خاں صاحب نے سحر کا ہاتھ پکڑا چھری تھمائی اور کیک کٹوایا۔ تالیاں بج رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا وہ خود سے کیک کیوں نہیں کاٹ سکی۔ اس کا چہرہ مسکرا رہا تھا اور نہ جانے کیوں میرا دل رو رہا تھا۔ سب لوگ تحفے دے رہے تھے میں بھی آگے بڑھا۔

"سالگرہ مبارک ہو۔" میری آواز جیسے صحراؤں میں گم ہو رہی تھی۔

"اوہ آپ ——" اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

"میرا ناچیز تحفہ قبول کیجئے گا۔" میں نے پینٹنگ اس کے حوالے کی۔ وہ ہاتھ میں لیے الٹ پلٹ کرتی رہی

"ڈیڈی —— یہ کیا ہے ——؟" اس نے جیسے خلاؤں میں پکارا۔

"یہ پینٹنگ ہے بیٹی۔ اس میں ساقی بھی ہے جام بھی ہے مینا بھی ہے اور ایک رند بھی۔ اس کے نیچے لکھا ہے ؎

تیری مخمور نظر کے یہ انوکھے انداز
جیسے کچھ خواب کسی رند کے برہم ہو جائیں
جیسے حافظ کو خیالات کو مل جائے شبیہ
جیسے خیام کے اشعار مجسم ہو جائیں

نہ جانے خاں صاحب کیوں اس شعر کی ادائیگی کے بعد آبدیدہ ہو گئے۔ میں پتھر کا بت بنا کھڑا رہا۔ مہمانوں کی تواضع کی جا رہی تھی۔ وہ منی کا ہاتھ تھامے ہر مہمان کے قریب جاتی اور ان کی خاطر کرتی۔ خاں صاحب برآمدے میں کھڑے تھے۔ میں بوجھل قدموں سے چلتا ہوا ان کے قریب پہنچا۔

"انکل سحر کو ——" میں اتنا ہی کہہ سکا۔

۔ ہاں نام اس کا سحر ہے مگر اُجالے اس کے نصیب میں نہیں۔ ایک حادثے نے اس کی بینائی ۔" اس کے آگے وہ کچھ کہہ سکے۔ ان کی آواز رقت سے بھرپور ہو گئی۔ تبھی دروازے پر کسی چیز کے ٹکرانے کی آواز آئی۔ وہ فوراً پلٹے۔ میں نے کتنی بار کہا کہ مُنّی کو خود سے الگ مت کرو۔ دیکھو چوٹ لگ گئی نا۔" خاں صاحب سحر کو تھامے کہہ رہے تھے اس کی پیشانی پر چھوٹا سا زخم اُبھر آیا تھا۔

ڈیڈی۔ یہ چوٹیں میرے لیے کوئی نئی نہیں۔ چوٹ کھا کر ہی تو سنبھلی ہوں میں۔"

وہ خاں صاحب کے سہارے آگے بڑھتی کہہ رہی تھی۔" ڈیڈی۔ آج آپ کو کیا ہو گیا۔ میری سالگرہ کا تحفہ دینا ہی بھول گئے آپ ——!"

خاں صاحب نے ایک سرد آہ بھری۔ ایک اداس نگاہ سحر پر ڈالی اور کہا " میری عمر تجھے لگ جائے ۔" ایک محبت بھرا پیار انھوں نے اس کے ماتھے پر نقش کر دیا۔

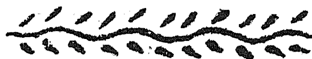
" ڈیڈی یوں نہ کہیئے ، سحر کو زندگی کی نہیں سہارے کی ضرورت ہے کب تک آپ مجھے ٹھوکریں کھاتا دیکھنا پسند کریں گے۔" وہ ان کے گلے لگ کر بلک پڑی —— ماحول اداسیوں میں ڈوب گیا۔ میں پتہ نہیں اپنے کمرے میں کب چلا آیا۔ رات بھیگتی رہی اور میں خیالات کے بھنور میں پھنسا رہا۔ آدھی رات گزرنے پر میں نے محسوس کیا کہ دروازے پر کسی نے دستک دی ہے میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ سحر میرے سامنے کھڑی تھی۔ سفید نائٹ گون میں وہ حور سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ ایک تقدس آمیز چمک اس کے چہرے پر تھی۔ مُنّی اب بھی اس کے ہمراہ تھی۔

سچائی کے اس آئینے کو دیکھ کر آپ گھبرا گئے نا! میں جانتی ہوں۔ اتنا کہنے آئی ہوں کہ دعوے حقیقت کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ روشنی زندگی کا پیغام ہے اور اندھیرے موت کا۔ بھلا کون ہے وہ جو موت کو زندگی پر ترجیح دے۔ مجھے آپ سے شکایت نہیں۔ میں جانتی ہوں آپ کی ماں کو ایک خدمت گزار بہو کی ضرورت ہے آپ کو ایک اچھی بیوی کی۔ آپ کے خاندان کو ایک ماں کی۔ میں ان خوابوں کی تعبیر نہیں بن سکتی۔ ہاں۔ ان ہیکلدوں کی تعریف میں آپ نے کئی اشعار لکھ بھیجے۔ میں سناتی رہی اور میں کبھی جواب نہ دے سکی مجھے وقت کا انتظار تھا۔ لاؤ ممی وہ سارے پرچے مجھے دے دو۔" اس نے ممی سے میرے دل کے ٹکڑے مانگے۔ اس نے انھیں میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"جن ہیکلدوں کو آپ زندگی سمجھتے تھے۔ جن میں آپ کو روشنی ہی روشنی دکھائی دیتی تھی۔ آج انہی اشعار کے نیچے یہ بھی لکھ دیں کہ —— کہ یہ ہیکلدے ویران ہیں۔" وہ پھوٹ پڑی۔ میں عالم سکتہ میں کھڑا رہا۔ سناٹے میں اس کی سسکیاں گونجتی رہی۔

"چند لمحوں بعد اس نے آنسو خشک کیے اور کہا۔ "ہو سکے تو کل صبح مکان خالی کر دیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ڈیڈی آپ سے کوئی امید وابستہ کر بیٹھیں۔ باپ جو ٹھہرے، مجھے پتہ ہے شب کی سیاہی کو کوئی اپنا مقدر نہیں بناتا۔ خدارا میری التجا سن لو میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں، مجھ پر رحم کرو۔ قبل اس کے کہ میں کوئی سنہرا خواب دیکھوں تم میرے افق کی سرحدوں سے پرے چلے جاؤ۔ میں تمہاری یاد کو زندگی کا سرمایہ سمجھ کر جی لوں گی۔ مگر تمہاری زندگی کو اک کرب مسلسل نہیں بنا سکتی —— خدا حافظ۔" یہ کہتی ہوئی وہ باہر نکل گئی۔ راستے میں کئی جگہ

وہ ٹکرا کر بجھتی رہی اور مجھ سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ میں اُسے سنبھال لوں۔ میری ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں آبشار بن گئیں اور میرے ذہن کے دریچے کھلنے لگے۔ میں نے دیکھا اماں کا حسرت بھرا چہرہ، ابا کی قہرآلود آواز، بڑے بھیا کی تیز نظریں، بھابھی اور بہنوں کے طنزیہ جملے، برادری کی لعن طعن ——— اور پھر وہ حقیقت جو سحر بن کر نمودار ہوئی اور شب بن کر میرے سارے وجود پر بکھر گئی۔ میں نے اپنا سامان یکجا کر لیا۔ اور موذن کی اذان کے ساتھ ہی گھر چھوڑ کر نکل گیا۔ مکان پر الوداعی نظر ڈالتے ہوئے میری پلکوں کے گوشے بھیگ گئے۔ آنسو کے چند قطرے آنکھ سے ٹپکے اور مٹی میں جذب ہو گئے۔ یہ میری بے چارگی کے تھے۔ یا اس کی بے بسی پر تھے یا پھر اپنی بزدلی پر ——— میں کچھ نہ سمجھ سکا اور تیز قدموں سے آگے نکل گیا۔ میرے دل نے دھڑک کر کہا۔ "تو وہ رند ہے جو میکدے میں رہ کر بھی پیاسا رہا۔" میں ویرانوں کی بستی سے نکل کر آبادی کی طرف چل پڑا تھا۔ پتہ نہیں یہ میری شکست تھی یا فتح ———



پرواز

تیرہ سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ اُمنگوں کے دن، تمناؤں کے راتیں، خوابوں کے جگنو، خیالوں کی باتیں۔ جہانِ خراب کے سوز و درد سے دور، نہ نشاطِ غم نہ سرورِ الم۔ وہ تھی اور اس کی معصوم حسرتیں جنھیں چن چن کر وہ اپنے ننھے دل میں سجا رہی تھی۔

پروانہ

قبرستان کی ٹوٹی ہوئی دیوار سے متصل زرینہ کا ایک کمرے والا مکان تھا جس میں وہ اپنی چھ بہنوں، دو بھائیوں اور والدین کے ہمراہ رہتی تھی۔ باپ رکشا چلاتا اور ماں گھروں میں کام کرتی۔ اس طرح اس خاندان کا گزارہ بڑی مشکل سے ہو پاتا۔ کئی وقت تو یوں بھی ہوا کہ بچے فاقے کر لیتے۔ زرینہ سب سے بڑی تھی بہ مشکل تیرہ سال کی ہوگی مگر بڑی ذہین، چست و چالاک اس کا میرے یہاں آنا زیادہ تھا۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ میرے اکثر و بیشتر کام وہی کر لیتی۔ ٹی وی کی وہ بے حد شوقین تھی فلموں سے اسے بڑی دلچسپی تھی۔ اکثر دوکان سے کیسٹ لاتی اور ڈرتے ڈرتے میرے حوالے کر کے یوں گویا ہوتی۔

"بی بی جی۔ یہ آپ کے لیے لائی ہوں۔ آپ کا دل بہل جائے گا نا!"

اس کی آنکھوں میں تمناؤں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا دکھائی دیتا اور میں انکار نہ کر پاتی۔ کھانے پینے کی بھی وہ شوقین تھی خصوصاً مٹھائیوں کی۔ گھر میں کچھ نہ ہوتا تو وہ بڑے ناز سے میرے پاس چلی آتی۔

"بی بی جی ـــــ آج آپ نے میٹھا کھایا ہی نہیں۔ بازار میں

سے لے آؤں ـــــــ " میں اس کی اس ادا پہ مسکراتی ۔ پرس سے پیسے نکال کر دیتی تو وہ دوڑتی ہوئی سویٹ ہاؤز چلی جاتی ۔

ان دنوں میرا بھائی سعودی سے آیا ہوا تھا ۔ گھر میں بڑی رونق سی آگئی تھی ۔ بچوں کے لیے ڈھیر سارے کپڑے کھلونے اور نہ جانے کیا کیا ـــــــ !

زرینہ ان تمام چیزوں کو حسرت سے دیکھ رہی تھی ۔ میں نے اسے ایک سوٹ دے دیا ۔ وہ اسے پاکر پھولے نہ سمائی تیرہ سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے امنگوں کے دن تمناؤں کی راتیں، خوابوں کے جگنو، خیالوں کی باتیں ۔ جہانِ خیالات کے سوز و درد سے دور، نہ نشاطِ غم، نہ سرورِ الم، وہ تھی اور اس کی معصوم حسرتیں جنھیں چن چن کر وہ اپنے ننھے دل میں بسا رہی تھی ۔

اپنے ساتھ اگر کبھی شاپنگ پر لے جاتی تو اسے کچھ نہ کچھ ضرور دلا دیتی آرائشی چیزوں سے اسے پیار تھا ۔ بڑے چاؤ سے وہ سنگھار کرتی کانوں میں نقلی بندے پہن کر موتیوں کی مالا گلے میں ڈالے رنگین چوڑیاں پہنے سب سے پہلے میرے ہی پاس آتی ۔

" بی بی جی ـــــــ میں کیسی لگ رہی ہوں ـــــــ " وہ اٹھلا کر پوچھتی ـــــــ

" بہت پیاری ۔ بالکل اس گڑیا جیسی ـــــــ " میں نے ٹی وی پر رکھے اس جاپانی گڑیا کی طرف اشارہ کر کے کہا ۔

" اللہ بی بی ـــــــ مجھے وہ گڑیا دے دیجئے نا ـــــــ " اس نے کچھ اس قدر للچا کر کہا کہ مجھ سے نہیں کہنے کی ہمت

نہ پڑی میں نے گڑیا اس کے حوالے کر دی۔
اسے سنبھال کر رکھنا زرینہ۔ یہ بہت نازک ہے۔" میں نے تاکید کر دی۔
میں اسے اپنی جان سے بھی زیادہ سنبھال کر رکھوں گی۔ اور وہ اسے لے کر چلی گئی۔
پھر جانے کیا ہوا اچانک ہی اس نے آنا بند کر دیا۔ مجھے بے چینی سی ہونے لگی۔ میں نے اس کے گھر نوکر بھیجا معلوم ہوا دروازہ مقفل ہے۔
پھر پندرہ دن گزر گئے۔ جانے کیوں مجھے اس کی جدائی شاق گزر رہی تھی۔ اچانک ایک شام وہ اپنی ماں کے ساتھ چلی آئی۔ چھم چھم کرتی۔
"کہاں چلی گئی تھی بے ایمان کہیں کی۔ ——" میں نے جھوٹ موٹ کی ڈانٹ پلائی۔ وہ میرے پیروں سے لپٹ گئی کھسیانی سی ہنسی ہنس کر بولی۔
"میں بے ایمان نہیں ہوں بی بی جی —— اماں سے پوچھو یہ مجھے خالہ کے پاس لے کر چلی گئی تھیں۔"
"بی بی یہ مٹھائی لیجئے ——" اس کی ماں نے برقعے کے اندر سے ایک ڈبہ نکالا۔
"زرینہ کی بات پکی ہو گئی۔ اگلی جمعہ کو نکاح ہو گا۔ منگنی کا یہ پڑھاوا ہے۔ ——" اس نے زرینہ کے خوب صورت پیر میرے آگے کیے جن میں چاندی کی اجلی سی چین یوں لگ رہی تھی جیسے کسی نے اس کے

پیروں میں زنجیر ڈالی ہو۔

ایک لمحے کے لیے میں چونک اٹھی جیسے کسی بچھو نے ڈنک ماری ہو۔ حیرت زدہ آنکھوں سے زرینہ کو دیکھا تو ایک عجیب سی چمک اس کے چہرے پر لہرا گئی جیسے تیز بارش کے بعد دھوپ کھل کر نکھر جاتی ہے۔ میں نے سیلے دی سے مٹھائی ہاتھ میں لے کر پوچھا۔

تو کیا ـــــ زرینہ کی شادی طے کر دی تم نے ـــــ!!

"ہاں بی بی ـــــ اچھا پیام آ گیا ـــــ لین دین کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ بس بچی پسند آ گئی انھیں۔ ہم پیلی کر کے بٹھا دیں گے وہ لال کر کے لے جائیں گے۔"

اس کی ماں نے بڑے پیار سے کہا اور نہ جانے کیوں میری آنکھوں کے آگے خون کی سرخی پھیل گئی۔

"بھلا یہ بھی کوئی عمر ہے شادی کی ـــــ" بہ مشکل تمام میں نے کہا۔

"ہماری شادی بھی تو اتنی ہی عمر میں ہوئی تھی۔ خیر سے دوسرے ہی سال تو زرینہ پیدا ہو گئی بڑے ہی فخریہ انداز میں اس نے مجھے بتایا۔

"لڑکا کون ہے ـــــ" میں نے پوچھا۔

"ہزاروں کا کاروبار ہے۔ ہر تیسرے مہینے حیدرآباد آ جاتا ہے بس ـــــ" وہ کچھ رکی "تھوڑا سا عمر کا فرق ہے۔" اس نے جملہ مکمل کیا۔

"کہاں رہتا ہے۔ ـــــ؟"

"دوبئی میں

"اچھا ـــــ تو یہ کہو کسی عرب کے حوالے کر رہی ہو۔"

میں نے جملہ کسا۔

"بیٹی کو کسی نہ کسی کے حوالے تو کرنا ہی پڑتا ہے جی جی ـــ وہ تو خود اپنی خوشی سے اس کا ہاتھ مانگ رہا ہے کپڑے لتے کی کوئی کمی نہیں۔ کھانا پینا بھی ماشاءاللہ بہت ہے۔ اور تو اور خرچے کے لیے ہمیں دس ہزار بھی تو دیے ہیں۔ ہم نے ایک رہن کا مکان بھی لے لیا۔ اب ہمارے دن پھر جائیں گے۔

اوہ ـــــ "ایک لمبی سانس لے کر میں نے کہا۔" تو یوں کہو تم نے سودا کیا ہے۔"

"غریب کی مجبوری کو سودے کا نام نہ دو جی جی۔"

"یہ کیسی مجبوری ہے کہ تم ایک معصوم کلی کو پھول بننے سے روک رہی ہو۔ یہ تو اس کے کھیلنے کے دن ہیں۔ کیوں اس کی زندگی سے ایسا مذاق کر رہی ہو۔" مجھ سے رہا نہ گیا۔

"شادی کو مذاق کہتی ہیں آپ ـــــ اس کا باپ رکشا چلا چلا کر خون تھوکنے لگا ہے۔ گھر میں نوجوانوں کی پرورش کیسے کر دل گی۔ کم سے کم زرینہ کے صدقے میں جی لیں گے سب ـــــ"

اس کی ماں کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"تم نے زرینہ سے پوچھا ـــــ کیا وہ خوش ہے۔" میرے اس سوال پر زرینہ کے چہرے پر ناگواری کا تاثر پھیل گیا۔

"زرینہ ـــــ میرے پاس آؤ ـــــ اب بتاؤ تم خوش ہو ـــــ" میں نے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔

"خوشی کیا ہوتی ہے بی بی ——— اچھے کپڑے، اچھے زیور، اچھا کھانا اور تفریح کرنا ——— یہی سب نا ——— ! اس نے میری آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔ میں اس کے سوال کا جواب بس اتنا ہی دے سکی۔

"خوشی کی دنیا ضرورتوں کی تکمیل سے آباد نہیں ہوتی ——— زرینہ ——— تو میرے پاس رہ جا میں بتاؤں گی تجھے خوشیاں کیا ہیں ——— "

وہ سہم کر پیچھے ہٹ گئی جیسے میں نے اسے مقید کرنے کی کوشش کی ہو میری گرفت اس کی باہوں پر ڈھیلی پڑ گئی۔

"میری گڑیا واپس دے دے زرینہ ——— میں نے اس کے احساس کو جھنجھوڑا۔ اس کی ہنستی نگاہوں میں نمی سی پھرنے لگی۔

"نہیں بی بی۔ میں اسے سنبھال کر رکھوں گی۔" اس نے گڑیا کو سینے سے لگا لیا۔ جو اس کے ہاتھ میں تھی۔

میں نے دیکھا اس کی آنکھیں خواب دیکھنے لگی ہیں مگر نہ جانے کیوں مجھے ان کی تعبیر بڑی بھیانک نظر آئی۔

"جاؤ ——— اسے رکھ لو۔" میں نے منہ پھیر لیا۔ وہ میرے پیر چوم کر نکل گئی۔ یکبارگی میرا دل چاہا دوڑ کر اسے اس کھائی سے کھینچ لاؤں اور اپنے سینے سے لگا لوں۔ مگر میں کچھ نہ کر سکی۔ وہ چھم چھم کرتی نکل گئی اور میں صرف اسے دیکھتی رہ گئی۔

زرینہ کا خیال میرے حواس پر چھایا رہا۔ میری گڑیا مجھے یاد آنے لگی۔ جیسے بڑے پیار سے میں نے سجا کر سنوار کر رکھا تھا۔ لاکھ مصروفیت

کے باوجود زرینہ میرے خیال میں چپکے سے چلی آتی۔ اور کانٹے کی طرح کھٹکنے لگتی۔ بار ہا میں نے اس کے گھر نوکر بھجوایا مگر ہر بار دروازہ مقفل رہا اور پھر پتہ چلا کہ وہ لوگ کسی اور جگہ منتقل ہو گئے ہیں۔ زرینہ سے ملنے کی رہی سہی آس بھی ٹوٹ گئی۔

پھر ایک ماہ کا طویل عرصہ گزر گیا۔ ایک شام میں اپنے کمرے کی بالکنی میں ٹھہری ہوئی تھی دفعتاً میرے گھر پہ ایک جیپ آکر رکی۔ پولیس کے چند جوان اترے اور ملازم سے میرے بارے میں استفسار کیا میں کچھ ٹھٹھک گئی۔ اشارے سے انہیں اوپر بلوایا۔

"میڈم ——— کیا آپ کسی زرینہ نامی لڑکی کو جانتی ہیں۔ انسپکٹر نے مجھ سے سوال کیا۔

"زرینہ ——— کیا ہوا اسے۔ کہاں ہے وہ۔ پچھلے ایک ماہ سے مجھے اس کی کوئی خبر نہیں ملی۔ کیسی ہے وہ ———" میں نے سوالات کی یورش کر دی۔

"ہم اسی کے بارے میں آپ کو بتانے آئے ہیں۔ وہ اس وقت ریسکیو ہوم میں ہے۔"

"ریسکیو ہوم ——— لیکن کیوں ——— ؟

"ایئر پورٹ پر اسے ایک شخص کے ساتھ گرفتار کیا گیا اور ریسکیو ہوم بھیج دیا گیا وہ اس شخص کے ساتھ جانے سے انکار کر رہی تھی۔ اس شخص سے پوچھ تاچھ جاری ہے لڑکی اپنے ماں باپ سے ملنے تیار نہیں اس نے آپ کا پتہ دیا ہے ——— وہ صرف آپ ہی سے ملنا چاہتی ہے۔"

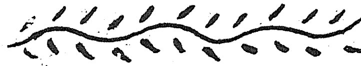
"میں چلوں گی ضرور چلوں گی ———"

اور پھر میری کار ریسکیو ہوم کی طرف گھوم گئی۔ گھر سے ریسکیو ہوم کار ستہ میں نے صرف یہ سوچتے ہوئے طے کیا کہ لڑکیاں آخر پیدا کیوں ہوتی ہیں! کہیں غربت کی وجہ بیچ دی جاتی ہیں کہیں جہیز کی وجہ جلا دی جاتی ہیں۔ کہیں دولت کے لیے نیلام چڑھائی جاتی ہیں۔ کہیں اندھے رسم و رواج کے ہاتھوں مسلی جاتی ہیں ——— ایک ہی بات رہ رہ کر ذہن کے اُفق پر اُبھرتی رہی تھی کہ بیٹیاں کب تک مدد مانگتی رہیں گی ——— ؟ میری آنکھوں تلے اندھیرا پھیلنے لگا ———

جب کار ایک جھٹکے سے رکی تو میں ریسکیو ہوم میں تھی۔ ایک وسیع و عریض ہال میں مختلف عمر کی لڑکیاں اور عورتیں موجود تھیں جن کے چہرے حالات کے ظالم پنجوں سے نُچے ہوئے تھے۔ جن کی زخم آلود پیشانی سے خونِ وقت کے لمحوں کی طرح ٹپک رہا تھا۔ جو اپنی سانسوں کا بوجھ بھی اُٹھا نہیں پا رہی تھی۔ اس ہال سے گزر کر میں اندرونی حصے میں پہنچی۔ ایک خوبصورت لان تھا جس کے آخری گوشے میں زرینہ بیٹھی آسمان کو تک رہی تھی میں نے اسے آواز دی اس نے گھوم کر دیکھا یوں لگا جیسے بیک وقت کئی سوالات میرے روبرو آ گئے ہوں۔ اس کے لب سِلے ہوئے تھے۔ سانسیں سسک رہی تھیں۔ دفعتاً وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کے آنسو میرے آنچل میں ڈھلتے رہے جب دل کا بوجھ ہلکا ہوا تب اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔

"بی بی جی۔ آپ نے کہا تھا نا کہ خوشی کی دنیا ضرورتوں کی تکمیل سے آباد نہیں ہوتی۔" اب بتایئے مجھے خوشی کیا ہوتی ہے کیسی ہوتی ہے۔ کہاں ملتی ہے ——— ؟؟

میں اس کے سوال پر لرز کر رہ گئی۔ یوں لگا یہ سوال وہ مجھ سے نہیں رہا سارے سماج سے کر رہی ہے۔ ساری انسانیت سے کر رہی ہے۔ جانے کتنی زرینائیں ہیں جو پنکھ مانگ رہی ہیں پرواز کے لیے۔



طوفان کے بعد

"تبھی ایک ننھا وجود اس کی گود میں کلبلایا اور ہاتھ پیر مارتا ہوا رونے لگا۔ اس نے اس پر نظر ڈالی۔ تین ماہ کا یہ بچہ صرف گوشت کا ایسا ٹکڑا تھا جس کی ننھی ننھی کلائیوں پر چمڑا نہ ہونے کے برابر تھا۔ چھوٹا سا دہن کھول کر جب وہ چلاتا تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس دنیا میں آنے کی سزا پر آنسو بہا رہا ہو۔

طوفان کے بعد

"اماں مجھے بھوک لگی ہے۔"

"اماں ایک روٹی دیدے نا!"

"اماں مجھے دودھ چاہیے —"

"اماں بسکٹ دلادے نا!"

پے در پے ممتا کے در پر دستک ہوتی رہی۔ وہ خاموش تھی جیسے پتھر کا بت آنکھوں میں ویرانی اور وحشت جھانک رہی تھی۔ ہونٹوں پر جمی پپڑیاں اس بات کی شاہد تھیں کہ اس نے شاید پانی بھی نہیں پیا۔ تبھی ایک ننھا سا وجود اس کی گود میں کلبلایا اور ہاتھ پیر مارتا ہوا رونے لگا۔ اس نے اس پر نظر ڈالی۔ تین ماہ کا یہ بچہ صرف گوشت کا ایسا ٹکڑا تھا جس کی ننھی ننھی کلائیوں پر جھریاں نہ ہونے کے برابر تھا۔ چھوٹا سا دہن کھول کر جب وہ چلّاتا تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس دنیا میں آنے کی سزا پر آنسو بہا رہا ہو۔

اس نے غور سے بچے کو دیکھا ——— شاید زبان خاموشی سے وہ یہ پوچھنا چاہتی تھی کہ تجھے اس دنیا میں آنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ یہاں تو پانچ کے ہی لالے پڑے تھے۔ مگر شاید یہ سوچ کر کہ اس میں اس

معصوم کا کیا قصور تھا وہ چپ رہ گئی۔ اور دل ہی دل میں اس نے رحمن کو کوسنا شروع کیا۔

کم بخت، نامراد بے ایمان —— کس نے کہا تھا کہ اسے پیسہ کمانے کے لیے۔ اتنا کافی تھا کہ تنخواہ سے روکھی سوکھی تو کھا لیتے۔ اگر یہ موئی شراب کی لت نہ ہوتی تو حرص بھی نہ ہوتی۔ جتنا کماتا ہے، اس سے بڑھ کر گنواتا ہے۔ آخر کار لالچ میں آہی گیا نا! بات تو معمولی سی تھی۔ صرف کسی کے قتل کے لیے اسے استعمال کیا جا رہا تھا۔ کام تو اتنا ہی تھا کہ لاش کو گڑھ میں ڈال دے —— اس نے بات مان لی اور بڑے پیار سے نجمہ کو منا لیا۔

"بس تیرا ساتھ چاہیے نجمہ۔ ہفتے پندرہ دن کی تو بات ہے۔ یوں ضمانت ہوئی اور یوں میں آیا۔ مجھے تو صرف ایک چھوٹا سا کام کرنا ہے۔ میں نے کون سا کسی کو قتل کیا ہے۔"

"ہائے اللہ! تم جیل جاؤ گے۔ پولیس کی مار کھاؤ گے۔" وہ خوفزدہ ہو گئی۔

"اونہہ۔ چھوڑ ان باتوں کو۔ اری پگلی جینے کے لیے کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ سات آدمیوں کا پیٹ اتنی آسانی سے کیسے بھر سکتا ہے بھلا۔"

"نہیں نہیں —— میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔" نجمہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"چھوڑ مجھے۔ موقع ملا ہے کچھ کر لینے دے۔ تیرے لیے چھپاتی ساڑی، کلائی بھر چوڑیاں لے آؤں گا!" وہ کپڑے جھٹک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"ابا —— مجھے سیکل نہیں دلاؤ گے ——" ننھا اکبر بڑے

دلارے پوچھا۔

"کہاں سے دلاؤں سیکل۔ تیرے نانا نے کوئی جائیداد رکھ چھوڑی ہے۔" وہ اسے پرے ہٹاتا ہوا باہر نکل گیا۔ اکبر سہما سہما بسور نے لگا۔ نجمہ دروازے کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

شادی کے بعد سے اس نے کون سی خواہش کی ہے۔ خود کو تو اس نے ایک ایسی مشین بنا لیا تھا۔ جو خاندان میں ہر سال ایک نئے فرد کا اضافہ کرتی۔ ان سات سالوں میں اس کا وجود حسرت کا ایک کھلا باب تھا۔ کانچ کے برتن میں کھانے کی آرزو سے لے کر سونے میں زرد ہونے کے سارے سپنے مٹی کے برتن کی طرح ٹوٹتے رہے۔ کبھی کبھار خواہشوں کا در کھل جاتا تو جھلاہٹ میں ایک آدھ جملہ اس کی زبان سے نکلتا جس کے جواب میں اُسے گھونسوں اور لاتوں کی بارش سہنی پڑتی۔ اس کا انگ انگ ٹوٹ جاتا اور آرزوئیں راکھ کا ڈھیر ہو جاتیں۔ وہ کرتی بھی کیا۔ ایک بوڑھا باپ تھا جس نے شادی کے تیسرے ماہ بعد ہی اپنی آنکھیں موند کر بے وفائی کر لی۔ دوسرے رشتے دار برائے نام تھے۔ سسرال میں اکتائے تو میکے میں چین پائے۔ یہاں میکہ تو تھا نہیں۔ اس کی پوری زندگی اپنے پانچ بچوں کے ساتھ صرف اور صرف رحمن کے اطراف گردش کر رہی تھی۔

ایک ماہ گزر گیا ______ نہ ساڑی آئی نہ چوڑیاں اور نہ خود رحمن ______ وہ سینے ہی کیا جس میں مستی نہ ہو، وہ سوچ ہی کیا جو مضطرب نہ ہو، وہ دل ہی کیا جو بے قرار نہ ہو۔ نجمہ کا دل بھی ماہی بے آب ہو گیا۔ تب وہ صاحب کے بنگلے پر پہنچی۔ اپنے بوسیدہ آنچل سے جسم کو اچھی طرح ڈھانک کر اس نے صاحب سے پوچھا۔

"رحمن ایک ماہ ہو گیا صاحب واپس نہیں آیا ——"

"اسے تو تین سال کی سزا ہو گئی ——" صاحب نے کچھ رکتے

سنبھلتے کہا۔

"تین سال کی سزا —— مگر اس نے تو کہا تھا کہ آپ اُسے پندرہ دن میں بلا لیں گے۔ اس کی آنکھوں میں خوف و ہراس کے سائے رینگنے لگے۔

"ہوش میں تو ہو تم —— ہم بھلا اسے کیوں چھڑائیں گے۔ اس نے جیسا کیا ویسا پایا۔" صاحب برہم ہو گئے

"مگر میرا رحمن تو بہت سیدھا سادا بھولا بھالا ہے۔ اسے تو کچھ بھی نہیں معلوم۔ آپ ہی نے تو اسے یہ کام کرنے پر مجبور کیا۔"

"دوبارہ یہ بات کہی تو دھکے مار کر نکال دوں گا نکل جا یہاں سے" وہ غصے سے بپھر گئے۔ اور وہ ڈگمگاتے قدموں سے بنگلے کے باہر آ گئی۔

"کم بخت بڑا چلا تھا پیسہ کمانے کے لیے۔ اس نے نفرت سے گردن جھٹک دی۔ اب کیا ہو گا —— یہ تین سال کیسے کٹیں گے —— کیسے پالوں گی میں انھیں —— وہ اسی سوچ میں چلی جا رہی تھی کہ کسی نے ٹھوکا دیا۔ وہ خیالوں کے جنگل سے آزاد ہو گئی۔

"دیکھ کر نہیں چلا جاتا ——" اس نے بابو کو پہچان لیا۔ محلے کا موالی

اس نے ساڑی کا پلو کمر میں کس لیا۔

"یہی تو مشکل ہے۔ تجھے دیکھ کر اور کچھ دیکھا نہیں جاتا۔"

"تو پھوڑ لے اپنی آنکھیں ——!" وہ جل کر بولی۔ ایک بے سُرا قہقہہ اس نے لگایا۔

"راج کرے گی۔ بات مان لے وہ اب آنے والا نہیں پتہ ہے

بچوں کو بھی پال لوں گا ـــــــ "

"چل ہٹ ـ" بخمہ کی آنکھوں میں نفرت پھیل گئی جیسے چولھے کا دھواں ـ وہ اسے دھتکار کر آگے بڑھ گئی ـ

کتنی گندی ہے یہ دنیا ـ کیسی باتیں سوچتے ہیں لوگ ـ وہ گھر کی طرف روانہ ہو گئی ـ اس نے سوچا وہ نوکری بھی تو نہیں کر سکتی ان پانچ بچوں سمیت اسے کون رکھے گا ـ بچے بھی قیامت سے کم نہ تھے ـ محلے میں ہی ایک بار کسی تقریب میں برتن دھونے کے لیے گئی تھی تو پوری ٹیم ساتھ تھی ـ کانچ کی پلیٹیں ایک دھکے میں ٹوٹ گئیں ـ اُجرت ملنا تو دور کی بات تھی گالیاں مل گئیں ـ ایک بار گھر پر ہی بچوں کو چھوڑ کر کام کے لیے گئی تو واپسی تک سنجھلے لڑکے نے اسکوٹر کی ٹکر کھائی ـ ایک ہفتے تک سرکاری ہسپتال میں مرہم پٹی کے لیے لے جانا پڑا ـ

گھر پہنچی تو بچوں نے ہنگامہ مچا رکھا تھا ـ سارے خالی برتن گھر میں بکھرے پڑے تھے ـ بچے گیند کی طرح انہیں اچھال رہے تھے ـ دل تو اس کا پہلے ہی جلا ہوا تھا ـ جی بھر کے اس نے بچوں کو پیٹا ـ بھوکے پیٹ مار کھا کر سب بچے سو گئے نیند کی دیوی بچوں پر بڑی مہربان رہتی ہے ـ چاہے ہنستے کھیلتے ہوں یا روتے سسکتے ہر حال میں وہ انھیں اپنے پہلو میں سمیٹ لیتی ہے ـ

اس نے تین ماہ کے بچے کو گود میں لیا ـ باہر سے دروازے کی چٹخنی لگائی اور چوراہے کی درگاہ کا رخ کیا ـ ان آستانوں میں تو کوئی بھوکا نہیں رہتا ـ اور کچھ نہیں تو دال چاول کا تو انتظام ہو جائے گا ـ درگاہ کی سیڑھیوں پر ہی معصوم وجود کو ڈالے اپنے چہرے کو چادر سے لپیٹے ہاتھ پھیلائے بیٹھی رہی تین گھنٹے گزر گئے ـ دس پیسے چار آنے سے بڑھ کر نہیں ملا ـ پورے گن کر دیکھے تو چھ روپے آٹھ آنے تھے ـ اس میں تو ایک کلو چاول بھی نہیں آ سکتے

وہ اداس ہو کر بیٹھ گئی۔ تبھی اس کی نظر ایک درمیانی عمر کی خاتون پر پڑی جو بڑے عقیدت و احترام کے ساتھ پھول کی ٹوکری ہاتھ میں اٹھائے جا رہی تھیں۔ اس کے پیچھے ایک اوسط عمر کا مرد بھی تھا جس کی کنپٹیوں کے بال سفید ہو چکے تھے۔ ان دونوں کے داخل ہوتے ہی سارے بھکاری ان سے لپٹ گئے۔

"اماں جی آ گئیں اماں جی آ گئیں۔"

"ارے آج تو اپنے نصیب ہی کھل گئے۔ کسی بھکارن نے کہا۔

"یہ کون ہے ——— اس نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ بھکارن نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو اتنا بھی نہیں جانتی یہ دینے والے ہاتھ ہیں اور ہمارے لینے والے۔

"تو نئی نئی آئی ہے نا ——— اس لیے انہیں نہیں جانتی۔ بڑے دھنوان ہیں۔ مگر قسمت کے مارے اولاد نہیں ہے نا! اسی لیے چکر کاٹتے ہیں۔ اس درگاہ کے شاید کبھی منت پوری ہو جائے،، بھکارن اتنا کہہ کر اٹھ گئی۔

نجمہ کے ذہن میں تیزی سے ایک خیال دوڑا۔

"کیوں نہ میں ——— اور وہ جھٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی اس ننھے وجود کو سینے سے لگائے اس ان کی شاندار کار کے پاس جا کر رک گئی۔ دونوں میاں بیوی واپس آ رہے تھے۔ سارے بھکاری ان کے اطراف ہالہ کیے ٹھہر گئے۔ سبھی کو خیرات مل گئی۔ اس نے سوچا۔

"کبھی کبھی لین دین کی بات بھی بدل جاتی ہے۔ شاید آج خدا نے انھیں مجھ سے خیرات لینے کے لیے بھیجا۔ کیا ہوا اگر ایک بچہ انھیں دیدوں اور تو پانچ میرے ساتھ رہیں گے۔ یہ تو آرام سے پل سکے گا۔ اس نے اس معصوم کی پیشانی چوم لی مگر جانے کیوں دل کے شیشے میں شگاف سا پڑ گیا۔

تبھی وہ کار کے قریب پہنچے۔

"سیم صاحب" اس نے پکارا۔ دونوں ہی نے مڑ کر دیکھا۔ اس نے اس کلبلاتے وجود کو آگے کیا۔

"کیا آپ اسے خرید لیں گے۔" الفاظ تحلیل ہو کر رہ گئے۔

"تم ——— تم اس بچے کو بیچ رہے ہو۔ عورت نے پوچھا۔

"جی ...... ——— ہاں .... ہاں۔ اس نے گردن ہلا دی۔

"مگر کیوں ——— ؟" مرد نے سوال کیا۔

"میرے اور بچے ہیں صاحب انہیں پالنا ہی مشکل ہے اس کے باپ کو تین سال کی جیل ہو گئی ہے۔ اگر آپ اسے خرید لیں تو دوسرے بچے جی سکیں گے۔ پتہ نہیں وہ کہاں سے اتنا بولنا سیکھ گئی۔

"تم .... تم اس کی ماں ہو ———" عورت نے بالآخر کہہ دیا۔

"ہاں .... ہاں میں ماں ہوں ـ" اس نے محسوس کیا جیسے وہ زمین کے اندر دھنسی جا رہی ہو۔ اس نے بھیگی پلکیں اوپر اٹھائیں۔ اس کی نظر کچرے کے ڈھیر پر دانہ چگتی ہوئی ایک مرغی پر پڑی۔ جس کے اطراف ننھے ننھے کئی چوزے تھے جنھیں وہ اپنی زبان میں پکار پکار کر دانہ کھلا رہی تھی۔ تبھی ایک بلی اسے گھورتے ہوئے قریب آ رہی تھی۔ مرغی نے غصے میں اپنے پیر پھیلا دیے سارے چوزے دوڑ کر اس کے پیروں میں چھپ گئے۔ اس نے بلی کی طرف تیز نظروں سے دیکھ کر پکارنا شروع کیا۔ بلی نے اپنے قدم پیچھے ہٹا لیے۔ ٹھیک اسی وقت نجمہ نے اپنے آگے بڑھے ہوئے ہاتھ سمیٹ لیے۔

"نہیں ـــــــ میں نہیں دوں گی اِسے ۔ اس بے زبان کے پاس ممتا ہے تو کیا میں .... نہیں ہرگز نہیں ـــــــ" اس نے فخریہ انداز میں گردن اٹھائی اور اس عورت کی طرف دیکھ کر کہا ۔

"تم کیا ہو کچھ بھی نہیں ـــــــ میں ـــــــ میں تو ایک ماں ہوں ـــــــ ماں ۔" دنیا کی مقدس ہستی ۔ کیا پتہ اس کوکھ سے پیدا ہونے والا کوئی انسان بنے یا فرشتہ یا پھر ....

اس نے اس وجود کو سمیٹ کر گلے لگا لیا ۔ اپنے بوسیدہ ساڑی کے آنچل میں اُسے لپیٹ کر کمر میں باندھ لیا اور اس سامنے والے کامپلکس کی طرف بڑھ گئی ۔ جہاں کئی عورتیں سروں پر سمنٹ کے ٹوکرے اٹھائے سیڑھیاں چڑھ رہے تھے ۔ شاید نجمہ کی ہمت کا یہ پہلا قدم تھا اس طوفان کے بعد ۔

سائباں

یہ دولت بھی عجیب چیز ہے شاید اس سے بڑھ کر بے وفا کوئی نہ ہو۔ کبھی کسی کی رفیق بن جاتی ہے، تو کبھی کسی کی رقیب —— مگر لگتی سبھی کو پیاری ہے۔ حسین اتنی کہ جس کے گلے لگ جائے دنیا کا سارا عیش سمٹ کر قدموں میں ڈال دے۔ اور بد صورت اتنی کہ اگر کسی سے دور ہو جائے تو آدمی کو خود کشی پر مجبور کر دے —— اس کے باوجود دنیا کی آرزو اور تمنائیں کر ماحول کو منتشر کر رہی ہے۔ اس ایک لفظ میں سمٹی کئی داستانیں بکھری پڑی ہیں۔

سائبان

سائبان ـــــــ جس کا نہ کوئی در ہے نہ دیوار نہ دریچہ ـــــــ ایک کھوکھلی پناہ گاہ جو تحفظ نہیں دے سکتی۔ سردیوں کی یخ بستہ رات ہو یا گرمیوں کی جھلسا دینے والی لو یا پھر طوفان کے تیز جھکڑ۔

مکان اور سائبان میں بہت فرق ہوتا ہے۔ انسان مکان میں خود کو محفوظ سمجھتا ہے کم سے کم جانور نما لوگ تو اندر نہیں گھس جاتے ـــــــ سائبان میں تو چاروں طرف سے حملے کا اندیشہ رہتا ہے۔

اب وہ سائبان میں ہی تو رہنے لگی تھی۔ مکان تو کب کا ٹوٹ چکا مکین ہی نہ رہے۔ ماں تو بچپن سے شباب کی طرف آتی ہوئی فلکی کو نظر بھر کر بھی دیکھ نہ پائی کہ نظر بند ہو گئی۔ لے دے کے ایک باپ ہی تو تھا۔

کیسے عیش کے دن تھے وہ ـــــــ اس کے چہرے پر تھوڑی سی ناگواری کے آثار بھی نظر آتے تو ماحول موسم کی طرح بدلنے لگتا پاپا کو فکر لاحق ہو جاتی۔ نوکر چاکر اس کے اردگرد منڈلانے لگتے۔ وہ شانِ بے نیازی سے حکومت کر رہی تھی۔ نہ کسی انقلاب کا خوف تھا اور نہ کسی دشمن کی خفیہ سازشوں کا، وہ تھی اور اس کی بے نیازیاں ـــــــ مگر اسے کیا پتہ تھا کہ قسمت بھی کبھی کسی مکار ساتھی کی طرح دغا دے جاتی ہے

ناز و نعم میں پلنے والی فلکی کو دھیرے دھیرے احساس ہونے لگا کہ زندگی خوش گوار ہوا کا جھونکا نہیں بلکہ تپتی دوپہر میں ریت پر چلنے کا نام ہے۔

پپا کا بزنس زوال کی طرف امادہ تھا۔ گھر کے حالات بدلنے لگے۔ آسائش کی گھڑیاں اُڑنے کو پر تولنے لگیں۔ ملازمین کی تعداد گھٹنے لگی۔ کپڑے لتے میں انحطاط آگیا۔ ضروریاتِ زندگی سمٹنے لگے۔ پپا کی صحت دن بہ دن گرتی جا رہی تھی۔ قرض کا بوجھ بڑھ رہا تھا۔ آخر ایک دن انھوں نے فلکی کو قریب بلایا۔

"فلکی ـــــــ بیٹی میں تجھے لفظوں کے کچے دھاگے میں نہیں باندھوں گا۔ میرے جیتے جی اگر تو حقیقت کی چٹانوں سے ٹکرانے کی ہمت پیدا کر لے تو میں سکون سے مر سکوں گا۔ میرے خواب ریت پر چٹانوں کے نشان کی طرح مٹ گئے۔ میری خواہش کینسر کے مریض کی طرح آہستہ آہستہ دم توڑ رہی ہیں۔ لاکھ کوشش کے باوجود میں تجھے زندگی کے سرسبز و شاداب گلستان کی سیر نہیں کروا سکتا۔ تیرے لیے زندگی ایک صحرا ہے، بیابان ہے ـــــــ شاید میرے بعد نخلستان بھی سامنے آ جائے۔ ہمت اور حوصلے کے پتوار کو تھام کر زندگی کے طوفان میں ناؤ کھیتی چلی جا ـــــــ" ان کی آواز بھر آگئی جیسے پیمانہ لبریز ہو گیا ہو۔

یہ دولت بھی عجیب شئے ہے شاید اس سے بڑھ کر بے وفا کوئی نہ ہو کبھی کسی کی رفیق بن جاتی ہے تو کبھی کسی کی رقیب ـــــــ مگر لگتی سبھی کو پیاری ہے۔ حسین اتنی کہ جس کے گلے لگ جائے دنیا کا سارا عیش سمٹ کر قدموں میں ڈال دے۔ اور بدصورت اتنی کہ اگر کسی سے دور ہو جائے تو آدمی کو خودکشی پر مجبور کر دے ـــــــ اس کے باوجود دنیا کی آرزو اور تمنا بن کر ماحول کو معطر کر رہی ہے۔ اس ایک لفظ میں سمٹی کئی داستانیں بکھری پڑی ہیں۔

فلکی کو پستی کی طرف آنا پڑا۔ اس نے ایک کمپنی میں ملازمت کر لی۔ عروج

سے زوال کا زمانہ ذہنی انتشار کا ہوتا ہے۔ ارتقار کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ بجھے بجھے سے لمحے، یادوں کے قافلے آدمی کو انقلابات سے دوچار کردیتے ہیں۔ فلکی کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ایک ایک کرکے زندگی کی قدریں لوٹتی گئیں۔ حالانکہ اس نے پیار کے جملوں کو لاٹھی سمجھ کر سنبھال لیا تھا۔ مگر پھر بھی وہ انسان تھی ——— احساسات اور کیفیات کا پیکر ———

مجبوری کے صبر آزما دنوں میں جب وہ باہر نکلی تو اس نے محسوس کیا کہ کھلے آسمان اور پھیلی ہوئی زمین کے درمیان وہ ایک سوکھے پتے کی طرح خلاؤں میں اڑ رہی ہے۔ کہیں ہوسناک نگاہیں، کہیں پُرفریب باتیں۔ کہیں جھوٹی تسلیاں اور کہیں عارضی التفات وہ سب کچھ سمجھتی تھی اور خود کو بچا کر سنبھال کر یوں رکھ لیتی جیسے لیٹروں کی بستی میں آگئی ہو۔

ان حالات میں اس کی ملاقات ثاقبؔ سے ہوئی۔ جو اسی کمپنی میں منیجر تھا۔ اپنے وجود کی تمام تر رعنائیوں کو جو حالات کی ضرب سے ریزہ ریزہ ہو رہی تھیں سمیٹ کر ثاقب کے سامنے پیش کیا تو اس نے بغیر محسوس طریقے پر فلکی کو اپنے دل کے فریم میں بٹھا لیا۔

"مس فلکی آج سے آپ میری سکریٹری رہیں گی ——"

"جی ——— جی بہت اچھا ——— وہ بوکھلا گئی۔ اور پھر وقت کے پرندے نے اپنے پر پھیلا دیے۔

فلکی جو حالات کی ستم ظریفی کا شکار تھی ثاقب کے سنجیدہ التفات پر مسحور ہوگئی۔ اور ثاقب تھا بھی اتنا وضع دار کہ اس نے فلکی کو اس کی کم مائیگی کا احساس کبھی نہ ہونے دیا۔ ریشم کا ایک مہین سا پردہ دو دلوں کے درمیان تھا۔ کوئی بھی اسے سرکانے کی کوشش نہ کرتا۔ مبادا کہیں انا کو ٹھیس پہنچے مگر پھر بھی ایک دن

ثاقب نے اظہار کر ہی دیا۔

"فلکی ـــــ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو دل چاہتا ہے ہر دم تمہارے ساتھ رہوں۔"

"ہم ۔۔۔۔۔۔۔ مگر ۔۔۔۔۔۔۔ میں تو ایک معمولی سی ۔۔۔۔"

قبل اس کے کہ وہ اپنا جملہ مکمل کرتی ثاقب نے اس کے منھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"میرے خیالات میرے اپنے ہیں میں نے تم سے رائے نہیں مانگی۔ اس لطیف احساس سے بھی گزر جانے دو میں مسرور بھی ہوں اور مطمئن بھی ـــــ"

ثاقب کے اس جملے نے فلکی کے لبوں پر خاموشی کی مہر لگادی مگر دل میں ہلچل مچادی۔

ثاقب ـــــ ثاقب ـــــ ثاقب

ایک نام ایک آواز ـــــ ایک گونج ـــــ درد کی لکیر کی طرح فلکی کے وجود میں جانے کہاں تک کھنچ گئی تھی۔ ایک خاموش کسک کے ساتھ ثاقب اس کے نہاں خانے میں آباد ہو گیا۔ اور اپنے وجود کے جگنو سے اس کے دل میں روشنی بکھیرنے لگا۔ وہ اس روشنی کے سہارے اندھیری راہوں پر چلنے لگی۔

معاش کی تلاش نے فلکی کو زندگی کے سارے تلخ تجربے سکھا دیئے اس نے اپنے آپ سے سمجھوتہ کر لیا۔ مجبوریاں انسان کو باغی بنا دیتی ہیں یا پھر منکسر ـــ

ثاقب نے امیدوں کے ننھے ننھے دیے جلا کر اس کے تخیّل کی دنیا آباد کر دی وہ خوابوں کے جزیرے میں مست خرام ہو گئی۔ اس نے حالات کا شکوہ کرنا چھوڑ دیا۔ ایک آس، ایک امید اس کی زندگی میں سانسوں کی طرح شامل ہو گئی۔

"ثاقب نہ ہوتے تو کیا ہوتا ـــــ" وہ پپا کی گرتی ہوئی حالت کو دیکھ کر سوچتی۔ کتنی ہمت دلایا کرتے تھے ثاقب۔ پپا کو بھی تو تسلی تھی مگر فلکی

اتنی خود دار بھی تھی کہ اس نے تحفے کے نام پر ثاقب سے کبھی کوئی خیرات نہیں لی وہ محبت کو دولت کے ترازو میں تولنے کی قائل نہیں تھی کیوں کہ محبت از خود ایک دولت ہے۔

ایک شام جب فلک کے ماتھے کی بندیا ڈوب رہی تھی پپا کی سانس ٹوٹ گئی۔ ایک زلزلہ آگیا ــــــ اس کا دل دہل گیا۔ آنکھیں فریادی بن گئیں۔ اور زندگی ایک سوال ــــــ ؟

فلکی سوچتی رہی ــــــ پپا نے کتنی بے رخی سے منھ موڑ لیا یہ موڑ بھی بڑے بے درد ہوتے ہیں۔ راستوں کے موڑ راہی بدل دیتے ہیں، درد کے موڑ دامن بھگوتے ہیں۔ اور زندگی کے موڑ حالات بدل دیتے ہیں۔

پپا کی موت کے بعد فلکی کو گھر بھی چھوڑنا پڑا۔ قرض اتنا کچھ تھا کہ مکان فروخت کرنا ضروری ہوگیا تھا۔ ایک چھوٹا سا کمرہ اس نے کرایہ پر لے لیا۔ اور اپنی پوری کائنات اسی میں سمیٹ لی۔ زندگی کی صعوبتوں سے گزرتی فلکی ثاقب کو ایک مضبوط ستون سمجھ رہی تھی۔ مگر یہ ستون بھی اس وقت گر گیا جب ثاقب نے اس کے وجود کو مجبوری کے بارود سے اڑا دیا۔

"فلکی ــــــ میں ــــــ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" فلکی صرف دیکھتی رہ گئی ــــــ

"کیسے کہوں ــــــ سمجھ میں نہیں آتا ــــــ" ثاقب جملوں کو تلاش کر رہا تھا۔ فلکی کے ذہن میں اندیشوں نے سرگوشی کی وہ ثاقب کے اڑتے ہوئے رنگ کو سمجھ رہی تھی۔

"ثاقب خود کو معمہ اور مجھے پہیلی نہ بناؤ ـ مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ سچ کا سامنا کر سکوں۔ میں خود تم سے ایک سوال کرنا چاہتی ہوں۔" دفعتاً فلکی

نے کہا۔

"مطلب ــــــ" ثاقب کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

"سیدھی سی بات ہے ــــــ میرے وعدوں کا حساب دے دو۔ میں اس ہجوم تنہائی سے گھبرا گئی ہوں۔" فلکی نے کہہ ڈالا ــــــ

"میں ـ ـ ـ ـ میں تمہارے ساتھ ہوں فلکی ــــــ" لفظ لوٹ رہے تھے۔

"ہاں یقیناً تم میرے ساتھ ہو ــــــ آنکھ میں نور کی طرح، دل میں دھڑکن کی طرح ــــــ مگر ــــــ مگر

"مجھے معاف کر دینا ــــــ ڈیڈی نے مجھے بیچ ڈالا ــــــ"

ثاقب رک گیا۔

بیچ ڈالا ــــــ کیا مطلب ــــــ" فلکی حیرتوں میں ڈوب رہی تھی۔

"ہاں فلکی۔ ڈیڈی کے دوست کا بہت بڑا بزنس ہے اور ڈیڈی نے اس کی پارٹنرشپ مجھے دلوادی اور اس کے بدلے ان کی لڑکی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا ــــــ میں ڈیڈی کے غصے سے واقف ہوں۔

"میں مجبور ہوں ــــــ" آخر کار سچائی کا سامنا فلکی کو کرنا ہی پڑا ـ

"اچھا ــــــ" وہ ایک لمبی سانس کھینچ کر رک گئی۔

"مجھے غلط نہ سمجھو ــــــ میں مجبور ہوں میں تو تمہیں دل سے پیار کرتا ہوں۔"

"نوازش ــــــ عنایت بڑے حوصلہ مند ہوا اور بے خوف بھی۔

بڑی وسعت ہے تمہارے دل میں۔"

جانے فلکی میں اتنا ٹھہراؤ کیسے آگیا۔

"مجھے غلط نہ سمجھو ——"

"نہیں —— میں تو خود غلطی پر تھی بھول تو مجھ سے ہوئی —— تم کمپنی کے منیجر اور میں ایک معمولی کلرک —— بھلا کیا میل تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ تم اس وقت مجھے ملے جب میں شدید طور پر زخموں سے کراہ رہی تھی۔ لفظوں کا مرہم دے کر تم نے میرے زخم بھر دیے اور میں —— میں پاگل —— تمہاری ہمدردی تمہارے رحم کو جانے کیا سمجھ بیٹھی۔

"مجھے معاف کردو فلکی —— میں شرمندہ ہوں" ثاقب کا جواب بے جان سا تھا۔

"بس کیجیے ثاقب صاحب —— اس افسانے کو یہیں ختم کیجیے۔ بڑی آسانی سے آپ نے دل کی سرحد پار کرلی یہ نہیں سوچا کہ آرزوؤں کی رہ گزر سونی ہو جائے گی۔ تمناؤں کی بستی اجڑ جائے گی۔ امید کی دنیا لٹ جائے گی۔ شاید —— شاید آپ کے پاس احساس کا کوئی مقام نہیں۔ چلو اچھا ہوا —— آزاد کردیا تم نے —— دل کے مکیں تو بن گئے مگر میرے لیے مکان کے بجائے سائباں دے دیا تم نے۔ یقین اعتماد بھروسے کے سارے گھروندے توڑ ڈالے تم نے ——" فلکی کے صبر کا بندھ ٹوٹ گیا۔

"ایسا نہ کہو فلکی —— میں تمہارا ساتھ ضرور دوں گا ——" ثاقب کے لہجے میں التجا تھی۔

"مجھے اپنا دوست سمجھو مجھ سے وفا کی امید رکھو —— "

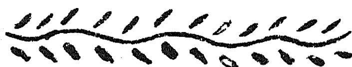
"ثاقب صاحب! وفا کے انمول موتی محبت کے سمندر میں، چاہت کی گہرائی میں جذبات کی سیپ میں بند رہتے ہیں۔ انھیں حاصل کرنے کے لیے پیرا کی سیکھیئے۔ اور وہاں ——— جذبات کو کشکول سمجھ کر کھو کھلے لفظوں کی خیرات اس میں مت ڈالیئے۔ آپ کا یہ التفات میں اپنے لیے ایک گالی سمجھتی ہوں۔ جائیے ——— جائیے یہاں سے۔ یہ رہ گزر آپ کی منزل نہیں ———"

فلکی نے دروازہ بند کرلیا۔

شام کا تھکا ماندہ سورج اپنی پناہ گاہ کی طرف رواں تھا۔ موذن کی اذان نے خدا کی عظمت کا احساس دلایا اور وہ سجدہ ریز ہو گئی۔

"اے مالکِ حقیقی میں سائباں میں ضرور ہوں مگر تیری پناہ چاہتی ہوں تو میرا محافظ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تیرے اس پھیلے ہوئے سائباں کے نیچے سبھی پناہ گزیں ہیں ———" اور پھر جیسے اس کے دل کو قرار آگیا۔ اک مضبوط سہارا مل گیا۔

اب بھی فلکی سائباں میں ہی رہتی ہے نہ کسی نے دیوار اٹھائی نہ کسی نے دریچہ کھلوایا۔ لوگ آئے اور چلے گئے ——— کوئی جگہ تیر نہ ہو سکی۔ فلکی کے چہرے پر وقت کی گرد نے کوئی تہہ نہیں چڑھائی بلکہ اس کے چہرے پر آج بھی مریم کی پاکیزگی اور زلیخا کی وفا کا نور چھلک رہا ہے۔



نا آشنا

گھر ـــــ جو رشتوں کا سنگم ہے۔ جس کے بغیر انسان
خود کو کتنا غیر محفوظ سمجھتا ہے............
.... اُس نے گاڑی اسٹانڈ کی، سگریٹ جلایا اور خلاؤں میں
دیکھنے لگا ـــــ وہاں اُسے یوری گگارن اور کبھی راکیش شرما
کے ہیولے دکھائی دیتے۔ انسانی سفر خشکی اور تری پر ہی نہیں
خلاؤں میں بھی جاری ہے ـــــ وہ زمانے کی تیز گامی پر محوِ حیرت
رہ گیا۔

نا آشنا

"کیا ہوا ـــــــ؟ بیوی نے سوال کیا۔

"کچھ نہیں ـــــــ؟" اس نے وہی تھکا ہوا جواب دہرایا۔

"اس طرح کب تک چلتا رہے گا ـــــــ؟" دوسرا سوال

"میں کیا کروں ـــــــ آفس سے نکل کر یہی تو کام کرتا ہوں۔ اب دیکھو تو نو بجے گھر لوٹا ہوں۔ اس نے اپنی تھکن کا احساس دلایا۔

"تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں گرمیاں اس دوزخ میں ہی گزارنی پڑے گی۔" بیوی کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

جواباً اس نے گھور کر دیکھا۔

"میرے لیے تو شاید ہر گھر دوزخ ہی رہے گا ـــــــ" دبے دبے لفظ اس کی زبان سے نکلے۔

"کیا کہا ـــــــ؟ بیوی کی آواز تیز ہو گئی۔

"یہی کہ گھر ضرور تلاش کروں گا۔" وہ چپکے سے وہاں سے کھسک گیا۔ عافیت اسی میں تھی کہ وہ بات کو طول نہ دے ـــــــ

میز پر کھانا لگا ہوا تھا۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر کھانے کے لیے بیٹھ گیا۔

"تم نے کھایا ——— ؟" اس نے پوچھا۔
"اتنے برسوں میں کبھی اکیلا چھوڑ کر کھایا میں نے" لہجے میں پیار تھا مگر ترش روئی کے ساتھ۔
"بچے سو گئے ——— ؟"
"ہاں ——— سرکس دیکھنے کے لیے ضد کر رہے تھے میں نے sunday کو لے جانے کا وعدہ کیا۔ ٹھیک کیا نا میں نے ———!"
بیوی نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
"تم بہت سمجھدار ہو ——— "وہ مسکرا رہا تھا۔
"جی ہاں ——— بڑی قدر کرتے ہیں نا آپ اسی لیے ———"
بڑے ناز سے اٹھلا کر چلے ہوئے لہجے میں بیوی نے جواب دیا۔
"ہوں ——— "اس نے کچھ اور کہنا چاہا مگر بھرپور لقمہ دانتوں کے درمیان انگرائی لے رہا تھا۔
"لو ——— ایک لقمہ میرے ہاتھ سے لے لو۔ کیا یاد رکھو گی۔ ——— "بڑے پیار سے اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔
"چلئے ہٹئے ——— "وہ شرما گئی۔ کھانا ختم ہوا۔ وہ ہاتھ دھو کر کمرے میں چلا آیا۔
گڈا اور بیو نیند کی آغوش میں تھے۔ چہروں پر معصوم مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی شاید پریاں کھیلنے آئی تھیں۔ اُسے بھی اپنے بچپن کے وہ دن یاد آگئے ——— وہ کاغذ کی کشتی وہ بارش کا پانی۔۔۔۔۔۔
"لیٹ جائیے ——— بہت تھک گئے ہوں گے نا! لائیے سر دبا دوں۔" بیوی کے لہجے میں شہد گھل گیا۔ وہ پیچ پیچ اس کا سر سہلانے لگی

"کتنی بھولی اور معصوم ہے یہ ——— " اس نے سوچا ——"
سچ ہے شریک زندگی ہم خیال ہو تو دنیا جنت ارضی ہے ورنہ ——— ورنہ جہنم سے بد تر۔

یہی سوچتے سوچتے اس کی نیند لگ گئی۔

معمول کی طرح صبح سویرے وہ اُٹھا۔ تیار ہو کر ناشتہ کئے بغیر اور بیوی سے کہے بغیر وہ باہر نکل گیا۔ اُسے مکان جو تلاش کرنا تھا۔ اُس نے سوچ لیا کہ وہ آج کسی صورت گھر تلاش کر ہی لے گا۔ پہلی تاریخ کو صرف چار دن ہی تو ہے۔ اڈوانس کی رقم کا بھی اس نے بندوبست کر لیا تھا۔

اس نے اسکوٹر اسٹارٹ کی ——— اور دوسرے ہی پل وہ مین روڈ پر تھا۔ چوڑی چکلی سڑک جس کے دونوں کناروں پر اونچے اونچے کامپلکس کھڑے تھے ——— ہر کامپلکس میں چالیس تا پچاس فلیٹس اور ہر فلیٹس میں لوگ ——— بے شمار لوگ۔ گھر ——— گھر ——— گھر ——— جو رشتوں کا سنگم ہے جس کے بغیر زندگی مکمل نہیں۔ جہاں دکھ اور سکھ پناہ لیتے ہیں۔ جہاں راز و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں۔ جہاں شکوے شکایتیں بھی ہیں اور صلح و صفائی بھی جہاں لڑائی بھی ہے اور امن بھی۔ جہاں جھگڑا بھی ہے اور آشتی بھی۔ جہاں آزادی بھی ہے اور خود مختاری بھی۔

گھر کے بغیر انسان خود کو کتنا غیر محفوظ سمجھتا ہے۔ بیوی کے ساتھ گھر بستا ہے اور بچوں سے گھر آباد ہوتا ہے ——— "

سامنے سے آتی ہوئی تیز رفتار بس کی زد سے بچتے ہوئے اس نے سوچا "مگر یہی گھر کبھی ایک فرد کی موت سے برباد بھی ہو جاتا ہے" ———
کہنے کو خدا کی پھیلی ہوئی زمین ہے اور تا حد نظر بیکراں آسمان بھی۔

گھر کبھی گھر چاہیے ـــــ زندگی کی ساری ضرورتیں سمٹ کر اس کے دامن میں آجاتی ہیں۔ ایک چھوٹی سی سلطنت جس کا حاکم مرد، جس کی وزیر اور سپہ سالار بیوی اور جس کی رعایا بچے ہیں۔

وہ خود کو فاتح سمجھ کر مسکرانے لگا۔ اب اس کی اسکوٹر گنجان آبادی والے علاقے میں آگئی جہاں حشرات الارض کی طرح بے شمار بچے ایک ایک جھونپڑی نما کالونی سے نکل رہے تھے۔ وہ گھبرا کر پلٹا ـــــ

اب اس کی اسکوٹر کالونی والے علاقے کی طرف مڑ گئی۔ اس نے Rental کا بورڈ تلاش کرنا شروع کیا۔ اس تلاش میں اس کی نظر ایک بڑے سائین بورڈ پر پڑی جس پر لکھا تھا۔ "پابولر ڈیری فارم" ـــــ اس نے پھاٹک کے سامنے اسکوٹر روک دی۔ ایک بڑا سا شیڈ جس کے نیچے ایک درجن سے زائد بھینس بندھی ہوئی تھی۔ کچھ دیر وہ دیکھتا رہا پھر یہ سوچ کر اسکوٹر پر بیٹھ گیا ـــــ ان چوپائیوں کو بھی مکان چاہیے۔ بے درو دیوار سا۔۔۔۔۔

اس کی اسکوٹر اب پھر سڑک پر آگئی۔ دفعتاً اسے بریک لگانا پڑا۔ ایک بڑا سا پتھر کسی نے سڑک کے بیچوں بیچ رکھ دیا تھا۔ اس نے راستے سے پتھر ہٹایا۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ٹرکس، کاریں، بسیں، اسکوٹرس، پیدل راہرو سبھی راستہ چل رہے تھے۔ سبھی راہرو تھے۔ سالار کارواں تو نظر نہ آیا مگر قافلہ چل رہا تھا ـــــ وہ تھکن محسوس کرنے لگا۔ سامنے ہی ایک بڑا نیم کا درخت اسے نظر آیا وہ اسکوٹر لے کر وہاں پہنچا۔ گاڑی اسٹانڈ کی سگریٹ جلایا اور خلاؤں میں دیکھنے لگا ـــــ وہاں اسے پوری گگارن اور کبھی راکیش شرما کے ہیولے دکھائی دیئے۔ انسانی سفر خشکی

اور تری پر ہی نہیں خلاؤں میں بھی جاری ہے ——— وہ زمانے کی تیز گامی پر محو حیرت ہو رہا تھا کہ اس کے سر پر کوئی چیز ٹپ سے گری۔ اس نے جھنجھلا کر سر پر ہاتھ پھیرا۔ پکی ہوئی نمبولی نے اس کے سر کو اپنا مسکن بنایا۔ وہ اسے ہاتھ میں لے کر سوچنے لگا کہ واقعی انتہا تک پہنچنے کے بعد ہر چیز کا اختتام ہی ہوتا ہے۔ پکا ہوا پھل ٹوٹ کر آپ ہی آپ گر جاتا ہے۔ اونچے اونچے درخت کی جڑیں کھوکھلی ہو جائیں تو وہ زمین بوس ہو جاتا ہے۔ عمر کی منزلیں طے کرتا ہوا انسان دہائیوں کی آخری منزلوں تک پہنچ کر آرام سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔۔۔

اور پھر غیر شعوری طور پر اس کی نگاہ اوپر اٹھی۔ ایک خوب صورت تنکوں کا آشیانہ تھا۔ جہاں چڑیا کے ننھے ننھے بچے چوں چوں کر رہے تھے وہ بڑے غور سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ چڑیا ہر تھوڑی دیر کے وقفے سے اُڑ جاتی اور پھر واپس آکر ان ننھے ننھے بچوں کی منہ میں دانہ ڈالتی ——— وہ سوچتا رہا۔ پرندوں کو بھی تحفظ چاہیئے۔ چار تنکوں کا مکان بنا کر یہ خود کو کتنا محفوظ کر لیتے ہیں۔ شکاری پرندوں سے اپنے ننھوں کو بچانے کا انتظام بھی۔

انسان تو پھر انسان ہے ——— رشتوں کا تقدس و احترام شفقت و پیار رکھ رکھاؤ تو اس کے خمیر میں رچے بسے ہیں پھر وہ کیوں کر گھر کی تلاش نہ کرے ———

اُسے یاد آیا ——— دنیا میں بھیجے گئے پہلے انسان کو بھی تو پناہ گاہ کی ضرورت رہی ہوگی۔ اُس نے پہاڑوں کی گپھاؤں میں اپنا آشیاں ضرور بنایا ہوگا۔ یا پھر درختوں کی گھنی چھاؤں ہی کو سائباں جانتا ہوگا۔

وقت کے ساتھ ہر چیز بدلتی ہے۔ پرانی چیزوں کے بدلے نئی چیزیں ——— غاروں سے نکل کر گھاس پھوس کے جھونپڑوں میں آ گیا ——— پھر مٹی کے گھر بنے ——— اس کے بعد اینٹ اور گارے کے مکان ——— انقلابات کا دور چلتا رہا۔ ذہن کے دریچے کھلتے گئے۔ علم و دانش، فہم و ادراک کے تازہ اور خوشگوار جھونکے اندر چلے آئے۔ پھر عمارتیں، کامپلکس، کوٹھیاں اور نہ جانے کیا کیا بن گئے ———

مگر پھر بھی آدم کی جستجو ختم نہ ہوئی ——— پناہ گاہ کی تلاش جاری رہی۔

تحفظ کا احساس اپنے ہی گھر میں ہو سکتا ہے۔ کسی غیر کے گھر میں طمانیت نہیں ملتی چاہے اس کی دیواریں کتنی ہی بلند کیوں نہ ہوں۔ اپنا گھر چاہے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو ——— سکون دیتا ہے۔ حکمرانی کا احساس دلاتا ہے رات کی دبیز چادر جب کائنات پر محیط ہو جاتی ہے تو ہر ذی روح اپنے بسیرے کا رخ کرتا ہے اپنی پناہ گاہ کی طرف چل پڑتا ہے

پناہ گاہ کے بھی کتنے نام ہے ——— گھر۔ مکان، جھونپڑی، فلیٹ، کوٹھی، آشیانہ، گھونسلہ، چھتہ، اصطبل، جانے اور کیا کیا ———

پرندے گھونسلے کو آشیانہ بناتے ہیں۔ درندے غاروں میں پناہ لیتے ہیں۔ چرندوں کے لیے سائبان یا شیڈ چاہیے۔ شہد کی مکھیاں چھتا بنا کر اپنا اور اپنی غذا کا تحفظ کرتے ہیں۔ چوہے زمین کے اندر دیواروں میں سوراخ کر کے اپنا ٹھکانا بناتے ہیں۔ کبوتر گنبدوں

میں پناہ لیتے ہیں۔ شاہین پہاڑوں کی اونچی چٹانوں پر بسیرا کرتا ہے۔ مچھلی کے لیے پانی کا گھر ہے۔ سانپ جیسے موذی جانور "بِل" کے نام سے گھر بناتے ہیں۔ دیمک لکڑی پر مٹی کا لیپ لگا کر اپنا مسکن بنا لیتی ہے۔ یہاں تک کہ پیدا ہونے سے پہلے بچے کا گھر شکم مادر ہوتا ہے۔

اس کے ہاتھ کا سگریٹ کب کا جل چکا تھا۔ راکھ زمین پر پڑی تھی۔ اس نے دوسرا سگریٹ جلایا —— وہ فکر کی محفل آراستہ کر بیٹھا تھا۔ اس محفل کے چھت پر لٹکے فانوس کی جلترنگ اُسے محظوظ کر رہی تھی۔ یکایک اس کے پیر میں کسی تیز چیز نے ڈنک مار دی۔ وہ "اف" کہہ کر کھڑا ہو گیا۔ پتلون کو سرکایا تو وہاں سرخ رنگ کی چیونٹی اس سے وار کر رہی تھی۔ اس کی نظر ایک سرخ لکیر کی طرف چلی گئی۔ جس کا سرا زمین میں ایک سوراخ سے مل رہا تھا۔ یہ چیونٹیوں کا علاقہ تھا۔

دفعتاً اسے یاد آیا انسانوں نے بھی تو اپنے لیے زمین دوز مکان بنا لیے ہیں۔ Cellars کے نام سے، تہہ خانے کے نام سے —— خفیہ کاموں کی پناہ گاہیں۔ بم سازی کے کارخانے، تشدد کے گھر —— یہاں تک کہ شیطان بھی اپنی جائے پناہ حاصل کر لی، مے خانے میں قمار خانوں میں —— مجرموں کے لیے جیل خانے سہی مگر یہ بھی تو پناہ گاہ ہے —— بے روح جسموں کے لیے بھی تو قبر نما گھر ہیں۔

غرض کہ دنیا میں کوئی شے ایسی نہیں جسے —— پناہ چاہیے۔ گھر چاہیے۔ یہاں تک کہ روح کا ٹھکانا انسانی جسم ہے۔ اور تو اور خدا نے بھی تو اپنا مسکن بنا لیا انسان کے دل میں —— اگر یہ جگہ اس نے حاصل نہ کی ہوتی تو یہ دنیا کیسی ہوتی ——

دہشت، بربریت، قتل خون، ظلم و جبر ______

مگر ان سب چیزوں کے ساتھ ساتھ انسانیت بھی تو مہر کا ب ہے یہ اگر نہ ہوتی تو بم کا ایک دھماکہ دنیا کو مٹا سکتا تھا ______ ابھی وہ زندہ ہے اور شاید قیامت تک بھی رہے گی۔۔۔ ___

انسانیت کی سریلی بانسری نے اس کے کانوں میں رس گھولنا شروع کیا اور وہ کسی سحر میں کھو گیا۔ تبھی اس کی اسکوٹر سے بھی کوئی ٹکرا یا۔

بے چارہ ایک درویش تھا ____ بوسیدہ کپڑے مگر چہرے پر بلا کا نور، گھنی لمبی داڑھی، دراز سفید زلفیں، سر پر ریشمی کپڑا۔ گلے میں عقیق کی مالا، ہاتھ میں تسبیح اور لب پہ اللہ کا ورد ۔۔۔ ــــ ۔۔ ــ

"معاف کرنا بابا ____ کہیں چوٹ تو نہیں آئی ______"

اس نے درویش کو اٹھایا۔

"بیٹا مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہوتا ہے"! ____ درویش نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں شرمندہ ہوں میری وجہ سے آپ کو چوٹ آئی ______"

اس نے درویش کی کہنی پر لگے خراش کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹا جسم کے زخم مرہم سے بھر جاتے ہیں مگر دل کے گھاؤ ہمیشہ ہرے رہتے ہیں۔" درویش کی آنکھوں کی چمک کی وہ تاب نہ لا سکا

"ہاں بابا ____ سچ کہتے ہیں آپ چلئے میں آپ کو گھر چھوڑ دوں"

____ اس نے سہارا دے کر درویش کو اسکوٹر کی پچھلی سیٹ پر بٹھانا چاہا۔

"گھر ____ نورانی چہرے پر مسکراہٹ کے اجالے بکھر گئے

"یہ گھر کیا ہوتا ہے بیٹا۔ مسافر کو تو بس پناہ چاہئے

____ ____

یہ دنیا تو عارضی سرائے ہے ۔ یہاں گھر کا کیا اہتمام کریں ——— شاید تم اس بات سے ناآشنا ہو ——— گھر تو دراصل دوسرے کے دل میں بنانا چاہیے ۔ اپنے عمل سے اپنے کردار سے اپنے اخلاق سے ———"
اتنا کہہ کر درویش آگے بڑھ گیا ۔

وہ احمقوں کی طرح سر ہلا کر کہنے لگا ۔ "ہاں میں تو سچ مچ ناآشنا ہوں"

" اٹھیئے ——— آٹھ بج گئے ———" اُس کی بیوی نے اس کے چہرے سے چادر کھینچ ڈالی ۔ گہری نیند سے وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا ——— نہ درویش تھا نہ اسکوٹر ——— کچھ بھی تو نہیں تھا ——— ہاں یاد اگر رہ گیا تو بس ایک لفظ " ناآشنا " ———



خوشی کی چھاؤں میں بیٹھا ہو تیرا آسماں ہے

غموں کی دھوپ میں بھی سکھ کا اہتمام کرو

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

فن اور مواد میں ارتقا کی داستاں

فریدہ زین کی کہانیاں

فریدہ زین کی کل ۳۳ کہانیوں کے تین مجموعے چھپ چکے ہیں۔ ہر مجموعے میں ۱۱ کہانیاں ہیں۔ پہلا مجموعہ "سسکتی چاندنی" ۱۹۷۹ء میں چھپ چکا تھا۔ دوسرا مجموعہ "دل سے دار تلک" ۱۹۸۲ میں شائع ہوا اور تیسرا مجموعہ "اے گردش دوراں" ۱۹۹۱ء میں منظر پر آیا

ان ساری کہانیوں کو پڑھنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ فریدہ زین کی زبان، فن اور کہانی کے مواد میں مسلسل ارتقا کی کیفیت واضح ہے۔ اور اپنی بساط کے مطابق اس مضمون میں اس پہلو پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔

کسی بھی فن پارے کی تہہ تک پہنچنے کے لیے ان عوامل کا جائزہ ضروری ہے۔ جو تخلیق فن کا جواز ہیں۔ ان میں بہت باتیں آجاتی ہیں۔ خود فنکار کی اپنی زندگی اس کے اتار چڑھاؤ۔ اس کا طرب و کرب اس سے فنکار کے ذہن کی ساخت ہوتی ہے اور ذہن کا مزاج بنتا ہے۔ پھر غم ذات کے ساتھ غم دوراں کا مشاہدہ بھی ہے اور فنکار نے اسے بھگتا بھی ہے۔ کبھی تو غم ذات غم دوراں کا حصہ ہی ہوتا ہے اور کبھی کچھ الگ بھی۔ غم دوراں اپنے سارے کرب کے ساتھ فنکار کے ذہن پر ارتسامات چھوڑتا ہے۔ یہاں سے تخلیق کی کشمکش شروع ہوتی ہے۔ فنکار نے اگر غم ذات

کے اظہار میں اپنی فنی تخلیق کا جواز بنایا تو یہ اظہار ایک معنی میں محدود ہو جائے گا۔ لیکن چوں کہ غمِ ذات اوروں کا بھی تجربہ ہے اس لیے سماج کے اس محزوں حصّے کا اپنا غم بھی ان تخلیقات میں منعکس ہو گا۔ اور یہی فنی تخلیق کی محدودی میں ہی سماجی اپیل کی بنیاد دینے گا۔

لیکن ذاتی کرب نے چوں کہ فنکار کے ذہن کو نہ صرف غم شناس بنا دیا ہے بلکہ دوسروں کے غم سے اس قدر شدید تاثر حاصل کرنے کے قابل بنا دیا ہے کہ وہ دوسروں کے غم کو بھی اپنا غم سمجھتا اور اس کے کرب سے مضطرب ہو جاتا ہے۔ یہ ایک طرح "غمِ ذات" کی ارتقا رہے۔ اس ارتقا کی اگلی منزل یہ ہو گی کہ فنکار ان غم انگیز عوامل سے مقابلہ کا حوصلہ پیدا کرے اور زندگی کو سنوارنے کے لیے جدوجہد کرے۔ زندگی جینے کے لیے ہے اور جینے کے لیے ناساعد حالات سے مقابلہ ضروری ہے۔ جہدِ حیات ہی حیات کا حیات افروز نام ہے۔ اب فنکار کے فن کا جواز جہدِ حیات ہے۔ پھر یہ جدوجہد بھی فن کار کی اپنی جدوجہد ہے اور انفرادی زندگی اب سماجی زندگی کا ایک حصہ بن چکی ہے۔ اس لیے زندگی کے آلام کے خلاف جدوجہد کے سماجی اجتہاد زیادہ نمایاں ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ سفر کا حصّہ ہے جہاں فنکار اور ادیب مشعل جہاد ہاتھ میں لیے سماج کے آگے آگے چلنے والی صفوں میں ہوتا ہے۔ اور اس کی فنی تخلیقات اب قطرہ میں دجلہ دیکھتا ہی نہیں دوسروں کو دکھاتے اور پھر خود دجلے کے بہاؤ کے تعین کرنے کا وسیلہ بن جاتی ہیں۔

فریدہ زین کی زندگی نے بہت کرب دیکھا ہے۔ ابتدائی عمر ہی میں باپ کی رحلت دیکھی۔ ماں کی ہاتھوں کی چوڑیاں ٹوٹتی دیکھیں۔ زندگی میں خلا پیدا ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

اس تاریکی میں جو امید کی کرن پھوٹی اور جس نے فریدہ کو حوصلہ دیا وہ

زین العابدین سعید ایڈوکیٹ (کھونگیر) سے ازدواجی رشتے میں منسلک ہوتا تھا۔ زین فریدہ کے لیے نہ صرف ایک اچھے شوہر تھے بلکہ ان کے توسن فن کو مہمیز بھی کی۔ ان کے اندر کا فن کار جو اس وقت انگڑائی لے کر بیدار ہو چکا تھا۔ جب وہ ساتویں جماعت کی طالب علم تھیں۔ اور جسے والد کی جدائی کے کرب نے کچھ سلا دیا تھا۔ اب زین کی مدد سے پھر جاگ اٹھا۔ اور فریدہ نہ صرف لکھنے لگیں بلکہ خاندانی روایات کی بندشوں کو توڑ کر چھپنے بھی لگیں۔

واضح رہے کہ روایتوں کی بندشوں کو توڑنے کا عنصر بھی اب ان کے مزاج میں داخل ہو گیا ہے۔ اور اس کے نمایاں اثرات ان کی کہانیوں میں ملتے بھی ہیں۔

اور ابھی ڈیڑھ برس ہوا کہ زین نے بھی داغ مفارقت دیدیا۔ پھر فریدہ کے کوئی اولاد نہیں۔ یہاں تنہائی ہی ان کی رفیق رہ گئی ہے۔

وہ اب لال ٹیکری میں غسلا ورذن اسکول کی پرنسپال ہیں اور تصنیف اور تعلیم ہی کی دو بیساکھیاں ان کی زندگی کا سہارا ہیں۔

ان کی کہانیوں کا ایک اجمالی تذکرہ ضروری ہے تاکہ اس میدان میں ان کے قلم کی جولانیوں کا جائزہ لیا جا سکے۔

"سسکتی چاندنی" کی پہلی ہی کہانی "ایک چراغ رہ گزر" میں قاری دیبا، شہاب اور اسلم کے مثلث میں محصور ہو جاتا ہے۔ اسلم کی شادی میں بھی وہ شریک نہ ہو سکا تھا۔

محسوس ہوتا ہے کہ شہاب کو دیبا میں دلچسپی بڑھنے لگی۔ شہاب اپنی کیا بھی سے بہت باتیں کرتا پھر دیبا کے کہنے پر وہ جانے لگا۔ لیکن فوراً واپس ہو گیا۔ اب اس کے ہاتھ میں اسلم کے ہوائی جہاز کے حادثے میں موت کا

تار تھا۔ دیبا کی مانگ اجڑ گئی۔ وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ یہ شاک کا نتیجہ ہے اور وہ اس سے بھی بڑے شاک ہی سے ہوش میں آسکتی ہے۔ چناں چہ شہاب اپنے بازو پر پستول چلا دیتا ہے اور اس دھماکے کی آواز سے دیبا آنکھیں کھول دیتی ہے۔

اب شہاب دواخانے میں ہے۔ خون کی ضرورت ہے۔ دیبا اپنا خون دے کر شہاب کو بچا لیتی ہے اور خود مر جاتی ہے

"شام ہو ڈوب گئی" میں آصف کا پیر حادثہ میں کٹ گیا۔ وہ دواخانے میں ہے۔ نکہت اس کی بیوی ہے۔ ماجد ان کا دوست، ماجد کو تاجی سے محبت تھی لیکن وہ مر چکی ہے۔ ماجد کو شبو سے پیار ہے۔ لیکن شبو کی شادی کسی اور سے کر دی گئی۔ اب وہ لاچار اور بے سہارا تھا۔ آصف نے پناہ دی۔ ایک دن نکہت نے چائے دی۔ گرم گرم چائے گر پڑی۔ نکہت نے "اُف" کہا اور ماجد نے نکہت کی ہتھیلی کے نیچے سیاہ تل دیکھا۔ اسے دفعتاً شبو کا خیال آگیا۔ اور اس نے تل کا پیار لے لیا۔ آصف کو غلط فہمی ہو گئی۔ اور اس نے ماجد کو گھر سے نکال دیا۔

شبانہ (شبو) کی شادی حسن سے ہو گئی تھی اور حسن آنکھیں کھو بیٹھا تھا۔ اور ماجد المیہ کہانیاں لکھ رہا تھا۔ ایک روز حسن کے گھر آتا ہے تو شبانہ سے ملاقات ہوتی ہے۔ ماجد کے اندر خود غرضی ابھرتی ہے۔ حسن کے اندھے پن سے فائدہ اُٹھا کر شبانہ کو لے اڑنا چاہتا ہے۔ شبانہ انکار کرتی ہے۔

ماجد گھر آجاتا ہے۔ پھر ایک حادثے کا شکار ہوتا ہے۔ اور شبانہ اور حسن دواخانے آتے ہیں۔ اور ماجد وصیت کرتا ہے کہ اس کی آنکھیں حسن کو دے دی جائیں۔ ماجد جو خود عشق کا مارا تھا اور اس کی زندگی تاریک تھی اب اپنی آنکھیں حسن کو دے کر اس کی زندگی کو منور اور شبانہ کی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے قربانی

دے رہا تھا۔ ماجد اور شبو کے اپنے اپنے کرب ہیں۔ فریدہ کہتی ہیں۔ "خوشی اور غم دو الگ الگ چیزیں نہیں یہ تو غم ہی ہے جو پل بھر کے لیے خوشی کا روپ دھار لیتا ہے۔"

"شب غم منور ہو گئی" اعجاز، شبنم، نسرین اور وسیم کے درمیان گھومتی ہے۔ اس کہانی میں شبنم کا کردار قابلِ توجہ ہے۔ وسیم کو شبنم سے محبت ہے لیکن شبنم اعجاز سے عشق کرتی ہے۔ اور وہ حادثے میں مرجاتا ہے۔ اس کی بہن نسرین بے سہارا ہے اور شبنم وسیم کا بیاہ نسرین سے کر دیتی ہے۔ وسیم شبنم کا نہیں ہو سکتا تھا۔ شبنم اعجاز کی یادوں سے روگردانی نہیں کر سکتی تھی۔ اور نہ ہی نسرین کی بے چارگی دیکھ سکتی تھی۔

"شمع ہر رنگ میں جلتی ہے" ساری کہانی رخصتی کے نام خط میں ہے۔ ترنم کی شادی الیاس سے کر دی جاتی ہے۔ لیکن ترنم کے کوئی اولاد نہیں ہوتی الیاس کا رویہ بدلتا ہے۔ ترنم کے کہنے پر الیاس رویئے سے دوسری شادی کر لیتا ہے۔ ایسے میں ترنم کا باپ مرجاتا ہے۔ کہانی بڑے اضطراب سے گزرتی ہے۔ ندیم کو ترنم سے محبت ہو جاتی ہے۔ لیکن ترنم کو کینسر ہو جاتا ہے۔ ندیم دیکھتا ہی رہتا ہے۔ فریدہ کہتی ہیں۔ "شمع کی طرح جلنا عورت کے حصے میں آیا ہے یا مرد کے۔"

"دستِ حنا" بھی ایک بڑی خوب صورت کہانی ہے جس میں پھر عورت کی قربانی کو مرکزی خیال بنایا گیا ہے۔

شمع کی شادی ہونے والی ہے جہیز پر تکرار کے بعد بارات واپس ہو جاتی ہے۔ "شمع دلہن تو بن سکی مگر سہاگن نہ بن سکی۔" اس کی بہن نگار ہے نگار کی شادی کیسے ہو؟ جہیز کہاں سے لایا جائے۔ اس دوران نوید شمع

سے محبت کرنے لگتا ہے۔ لیکن شمع نے کیا کیا۔ شمیم احمد کا چھوٹا لڑکا نگار کے لیے منتخب ہوتا ہے لیکن مطلوبہ جہیز کہاں۔ شمع نے ایک انوکھا فیصلہ کیا۔ شمیم احمد سے کہتی ہے کہ وہ خود ان کے بڑے لڑکے اعجاز سے شادی کے لیے تیار ہے۔ جو کینسر کا مریض ہے اور زندگی کے دن گن رہا ہے۔ اور شمیم احمد بغیر جہیز کے اپنے چھوٹے بیٹے سے نگار کی شادی قبول کر لیتے ہیں۔

شمع نے شادی تو کرلی۔ مگر اعجاز پر آپریشن کامیاب نہ ہوا اور وہ چل بسا۔ شمع پاگل ہو جاتی ہے اور نوید آنسو بہاتا نظر آتا ہے۔

"ویراں ہے میکدہ" میں سحر اندھی ہے۔ لیکن نہایت حسین۔ آفتاب ان کے گھر میں کرایہ پر رہتا ہے۔ اسے سحر سے عشق ہو جاتا ہے۔ سحر جواب ٹالتی رہتی اور آخر میں اپنی سالگرہ کے دن جواب دینے کا وعدہ کرتی ہے۔ کہانی میں سسپنس قابل توجہ ہے سالگرہ کے دن پتہ چلتا ہے کہ سحر اندھی ہے۔ اب آفتاب کا امتحان ہے۔ سحر سے کہتی ہے کہ وہ صبح ہوتے ہوتے گھر خالی کر دے کہیں سحر کے والد کی امید نہ جاگ جائے کہ سحر کی زندگی کبھی آفتاب سے منسلک ہو سکتی ہے۔ اور آفتاب چلا جاتا ہے۔ آفتاب بزدل ہے۔

"بے نیازی حد سے گزری" میں زیبا کی شادی جس سے ہوتی ہے وہ رخسانہ سے عشق کرتا ہے۔ جو اس کی نہ ہو پاتی۔ زیبا ایک فرماں بردار بیوی کی طرح رہتی ہے۔ اس کی شادی کوششیں رائیگاں جاتی ہیں۔ اور اس کا شوہر رخسانہ ہی کی یاد میں مسرور رہتا ہے۔

پھر کہانی ایک موڑ لیتی ہے زیبا نے ایک چھٹی لکھی اور میکے جا کر زہر کھا کر مر جاتی ہے۔ زیبا لکھتی ہے کہ اسے ظفر سے پیار تھا لیکن ظفر کے یاں باپ نے اس کی شادی کہیں اور کر دی۔ وہ بھی مجروح تھی لیکن اس نے زندگی سے

صلح کرلی اور اپنے شوہر پر جان چھڑکتی تھی۔ یہ اس کے شوہر کے منھ پر طمانچہ تھا۔
وہ دوڑا جاتا ہے لیکن زیبا مر چکی تھی۔ اور ظفر اسے کاندھا دے رہا تھا۔

"بہار دے کر خریدے گئے ویرانے" میں مونا کا کردار ابھارا ہے۔
مونا کا باپ چار بچوں کو چھوڑ کر مر جاتا ہے۔ مونا ملازم ہو جاتی اور بچوں کی پرورش
کرتی ہے۔ ضیا کو مونا سے عشق ہے۔ ایسے میں اکرام در آتا ہے۔ مونا اسے نکال دیتی
ہے۔ لیکن سیما کو اکرام سے لگاؤ ہے اسے غلط فہمی ہوتی ہے۔ مونا اکرام کو بلاتی
ہے اور سیما سے اس کا نکاح کروا دیتی ہے۔

مونا ضیا کے گھر پہنچتی ہے واپسی میں ہما (ضیا کی بیوی) کی مونا کی موٹر
سے ٹکر ہو جاتی ہے۔ اس کی بچی حنا سے بات ہوتی ہے یہاں مونا کو معلوم
ہوتا ہے کہ ضیا نے شادی کرلی۔ ہما اس کی بیوی ہے اور حنا اس کی بیٹی
وہ حنا کو مونا کے نام سے پکارتا ہے کیوں کہ مونا نام اسے بہت عزیز ہے۔ حنا
کی سالگرہ پر مونا جاتی ہے لیکن ضیا سے ملے بنا حنا کو تحفے دے کر لوٹ جاتی ہے۔
اور ساری عمر انسانیت کی خدمت میں گزار دینے کا عہد کرلیتی ہے۔

"ایک شیشہ اور ٹوٹا" شالو کا المیہ ہے اس کی ماں نینی تال میں
پہاڑی سے گر کر مر جاتی ہے۔ باپ قلب کا مریض ہے۔ شالو اپنے محبوب ایاز سے
کہتی ہے کہ شادی کرلو تاکہ اس کے باپ کی زندگی بدل جائے۔ لیکن ایاز
اپنے ماں باپ کی مرضی کے خلاف نہیں جا سکتا۔ ایسے میں شالو اسکول میں
نوکر ہو جاتی ہے۔ جنید کو اس سے لگاؤ ہو جاتا ہے وہ کسی کارخانے میں نوکر
ہوتا ہے۔ اب شالو جنید سے شادی کرلیتی ہے۔ شہزاد پیدا ہوتا ہے۔ لیکن
جنید مر جاتا ہے۔ اب شالو کے لیے زندگی کا سہارا محض شہزاد ہے۔ اس کی
شادی سمیرہ سے کر دیتی ہے۔ لیکن سمیرہ اور شہزاد بڑی بے مروتی کا مظاہرہ

کرتے ہیں اور شالو کو چھوڑ کر امریکہ چلے جاتے ہیں۔ شالو کی آنکھیں میں صرف آنسو رہ جاتے ہیں۔

"کانٹوں سے دل کے چاک سیے"، شفا کی کہانی ہے۔ اسے مضراب سے عشق ہے۔ لیکن اس کی شادی ثاقب سے ہو جاتی ہے۔ پپو ان کا بیٹا ہے۔ ثاقب کا کسی حادثے میں انتقال ہو جاتا ہے اور شفا بھی آگ میں جھلس کر بدشکل ہو جاتی ہے۔ ایسے میں ثاقب سے ملاقات ہوتی ہے۔ شفا مضراب سے التجا کرتی ہے کہ وہ پپو کو اپنا لے اسے باپ کی محبت کی ضرورت ہے۔ اور دوسرے ہی دن شفا کی لاش ملتی ہے وہ ڈوب کر جان دے چکی تھی۔ اس کی بند مٹھی میں کانٹے تھے جو مضراب نے دیے تھے۔ آخر کانٹوں سے بھی تو دل کے چاک سیے جاتے ہیں۔

"سسکتی چاندنی" چاند کے کرب اور اس کی قربانی کی کہانی ہے۔ چاند کو صباحت سے محبت تھی۔ مگر صباحت چاند کی بہن عفت پر جان دیتا تھا۔ ان کی شادی ہو جاتی ہے اور چاند اسے برداشت کر لیتی ہے۔ عفت کے بچہ ہوا۔ گڈو، مگر عفت جان دے گئی۔ اب گھر صباحت گڈو اور چاند کے چوکھٹے میں محصور تھا۔ چاند تینوں کی خدمت کرتی ہے۔ صباحت کو چاند سے ہمدردی ہونے لگتی ہے۔ اور بڑھتی ہی جاتی ہے۔ صباحت سے چاند کو محبت تھی لیکن صباحت کو چاند سے "ہمدردی" تھی اور اس کے بیٹے اور اس کے لیے ضرورت چاند کو یہ سودا منظور نہ تھا۔ اچانک باورچی خانے میں چاند جھلس جاتی ہے اور پھر مر جاتی ہے۔ مرتے مرتے بھی صباحت کو "بھیا" کہتی ہے اور گڈو اور اس کی امانت اس کے سپرد کرتی ہے۔

"سسکتی چاندنی" کی کہانیوں میں زبان کی چاشنی کے علاوہ رومانی

فضاد ھندلائی ہوئی چھائی ہوئی ہے۔ عورت کی قربانی مرکزی خیال ہے۔ مرد بزدل بھی ہے اور روایات کی پاسداری کے نام مجبور سے کنارہ کشی اختیار کرسکتا ہے۔ ان کہانیوں میں عورت کا درد، کرب اور اضطراب مرکزی خیال محسوس ہوتا ہے۔

"دل سے دار تک" مجموعہ کی کہانیاں آگے بڑھتی ہیں۔

"دل سے دار تک" "دلبر" کی قربانی کی کہانی ہے۔ امان، نائلہ اور دلبر اس کہانی کے کردار ہیں۔ خالہ جان چاہتی ہیں کہ امان کی شادی نائلہ سے کردی جائے۔ اور دلبر سے قربانی کی درخواست کرتی ہے۔ اب دلبر کا کردار دیکھئے خالہ کہتی ہیں کہ وہ اپنے آپ کو امان پر بیوہ ظاہر کرے۔ وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ اور یہ کہتی ہے کہ اس کی شادی ہو چکی ہے۔ اور ایک سہاگن کا روپ دھارے امان کے سامنے آتی ہے۔ امان دلبر پر برس پڑتا ہے۔ اس نے امان کی محبت کو رسوا کیا ہے امان نائلہ سے شادی کرلیتا ہے اور جاتے ہوئے دلبر کو کھری کھری سناتا ہے۔ دلبر اور خالہ کے کرداروں پر غور کیجئے۔

"خوابوں کے کھنڈر" میں حمید رکشا والے کی بیوی مر چکی ہے اور وہ اپنے بیٹے وحید کو ڈاکٹر بنانا چاہتا ہے۔ بیوی کی یادوں کو تازہ رکھنا چاہتا ہے۔ رکشا چلاتا ہے اور وحید کو پڑھاتا ہے۔ اب وحید کو ڈاکٹری کی تعلیم کے لیے کالج میں شریک ہونا ہے۔ دو ہزار روپیے چاہئے کہاں سے آئیں۔ ایسے میں رکشا رانی کے ایک مقابلے کا اعلان ہوتا ہے۔ جیتنے والے کو ۴ ہزار ملیں گے۔

حمید اسے سنہرا موقع جان کر مقابلے میں شریک ہوتا ہے۔ اور ایک بے خودی کے عالم میں رکشا دوڑاتا ہے۔ بیوی کی یاد آتی ہے ذرا جھکتا ہے اچانک حادثے کا شکار ہوتا ہے اب وہ دواخانے میں ہے۔ دونوں پیر

کٹ چکے ہیں۔ انعام کسی اور کو ملا۔ اور حمید کو بیساکھیاں۔ اب وحید رکشا چلا رہا ہے اور حمید بیساکھیوں کے ساتھ اس میں بیٹھا ہے۔ یہ اس کے خوابوں کی تعبیر ہے ——— کھنڈر

"چندا کی چاندنی —" لاجو کے جڑواں بچے پیدا ہوتے ہیں وِنئے اور وِجئے۔ پھر لاجو کا شوہر پریم کارخانے میں حادثے میں مر جاتا ہے۔ اس پر بیوگی طاری ہے۔ نہ گھونگھٹ کی چمک، نہ چوڑیوں کی جھنک اور نہ پازیب کی سنگیت اس کے بچے اسے ماں ماننے سے انکار کر دیتے ہیں اور کھانا بھی نہیں کھاتے۔ لاجو بچوں کی خاطر پھر سہاگن کا ڈھونگ رچاتی ہے لیکن بستی والوں کو گوارا نہیں۔ چہ میگوئیاں لعن طعن، سبھی سنتی ہے۔ پھر وہ بچوں کو لے کر نکل جاتی ہے۔ بچوں کو رام دیال کے پاس چھوڑ کر وہ اسلم میاں کے پاس نوکری کر لیتی ہے۔

پھر بستی میں فساد ہوتے ہیں۔ انھیں لوگوں سے جنھوں نے اسے گھر سے نکالا تھا۔ مخاطب ہوتی ہے۔ میں بدمعاش، آوارہ ذلیل سہی مگر وقت ایسا ہے کہ تمہیں میرے یہاں پناہ لینی پڑے گی۔" تخاطب نہیں تازیانہ ہے اس کے دونوں بچے فسادیوں کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں۔ اب لاجو سفید ساڑی میں بیوگی لیے گھومتی رہتی ہے اور کہتی ہے "دیکھو تو وِنئے اور وِجئے نے مجھے چندا کی چاندنی کی طرح بنا دیا۔ میں چندا کی چاندنی ہوں۔

"دل ایک سجدہ گاہ" میں ڈاکٹر الیاس اور نگار میں محبت ہے۔ لیکن ڈاکٹر الیاس دھوکہ دیتے ہیں اور شادی کر لیتے ہیں۔ ان کے ایک لڑکی شیبا ہوتی ہے۔ نگار نے شادی نہیں کی اور ایک لڑکے ثمر کو گود لے لیا۔ شیبا اور ثمر میں محبت ہے۔ نگار اس شادی کے خلاف ہے۔ الیاس شیبا کی خاطر نگار کے گھر جاتے ہیں۔ اور نگار کو دیکھ کر حیرت میں پڑ جاتے ہیں۔ نگار انھیں توب

بھٹکارتی ہے اور اپنے لڑکے سے شیبا کی شادی سے انکار کر دیتی ہے۔ الیاس مایوس لوٹ آتے ہیں۔ نگار اپنی محبت کی تذلیل کا بدلہ لے رہی ہے۔

دوسری صبح نگار ثمر کو ساتھ لے کر الیاس کے گھر آتی ہے اور الیاس کو حیران کر دیتی ہے۔ جب وہ شیبا کو بہو کہتی ہے۔ اور نگار نے شادی کیوں نہ کی؟ فریدہ کو سنئے۔

"جس کی زندگی محبت ہو اور جو محبت ہی کو عبادت بنا لے اسے شریک زندگی کی کیا ضرورت ہے۔

"پلکوں کی چھاؤں میں" وہ دل کے جان لیوا مرض میں مبتلا تھا۔ باپ نے کافی دولت چھوڑی تھی۔ دور نزدیک کے رشتہ داروں پر جی کھول کر خرچ کیا۔ اور خود المیہ ناولیں لکھنے لگا۔ ناولوں سے خوب آمدنی ہوتی تھی۔ وہ کبھی خیراتی کاموں پر خرچ کر دیتا۔ اس کا تہنیتی جلسہ ہے اور وہ قلب پر حملے سے وہیں اسٹیج پر مر جاتا ہے۔ اس کے سارے "رشتے دار اس کے اثاثے پر قابض ہیں۔ ایسے میں ایک دوشیزہ آتی ہے اور اپنا حصہ طلب کرتی ہے رشتہ داروں سے تکرار ہوتی ہے وہ پوچھتے ہیں اس کا رشتہ کیا ہے فنکار کے ساتھ۔ وہ کہتی ہے کہ یہ بے غرض اور بے لوث رشتہ ہے۔ تیزی سے الماریاں کھولتی ہے اور ساری کتابیں صندوق میں بھر لیتی ہے۔ اور اسے ٹیکسی میں رکھوا کر چلی جاتی ہے۔ یہاں فریدہ زبان حال سے پوچھتی ہیں ادیب کس کا تھا۔ کیا وہ اپنے رشتہ داروں کا تھا۔ اور کہتی ہیں۔

"ادیب مر کر بھی زندہ تھا کسی کی پلکوں کی چھاؤں میں۔"

"منزل" کی ہیروئین آفریں ایک کالج کے فاؤنڈر عمران بیگ کی بیٹی ہے۔ زبردست انا کی مالک ہے۔ اپنے حسن پر ناز بھی ہے اور شادی

کر کے ماں بن کر اس پر آنچ بھی نہیں آنے دینا چاہتی۔ روشن سے عشق ہے لیکن شادی نہیں کرتی۔

وہ کالج آتی ہے لوگ تعریفوں کے پل باندھتے ہیں اور وہ خوش ہوتی ہوئی نکل جاتی ہے۔ حسن پر ناز جو ہے۔

کالج میں تقسیم انعامات کا جلسہ ہے۔ آفرین نے انعام شنید کو دیا۔ اور شنید نے انعام لیا اور بے التفاتی سے لوٹ آیا۔ آفرین کو حیرت ہوئی۔ اس حسینہ کو ایسی بے التفاتی کا تجربہ نہ ہوا تھا۔

اب وہ شنید کو ساتھ لیے گھر آتی ہے۔ "اکیلی" نہیں جانا چاہتی۔ شنید اسے "آنٹی" کہتا ہے وہ اور بھی بے چین ہو جاتی ہے۔ اور پھر شنید سے کہتی ہے کہ وہ جائے اور دوسرے دن وہ کالج میں اس سے ملنے آئے گی۔

دوسرے دن وہ جاتی ہے تو روشن اس کی بیوی شہلا موجود ہیں اور اور شنید ان کا لڑکا ہے۔ آفرین کو ایک بچے کی ماں شہلا بہت حسین معلوم ہوتی ہے۔ اس سے لپٹ جاتی ہے اور روشن سے کہتی ہے "حسن کو زوال ہے لیکن گھر دار اور بال بچوں سے وہ لازوال ہو جاتا ہے۔

"بسیرا" میں ایک کامپلکس کی تعمیر کی کہانی ہے۔ رحمت گاؤں میں مسلسل قحط کی تباہ کاریوں سے گھبرا کر کام کے لیے شہر آتا ہے۔ ناز و سے واپس آکر شادی کا وعدہ کرتا ہے۔

شہر میں بسیرا کی تعمیر میں لگ جاتا ہے۔ اس کے گیاریج میں رہتا ہے۔ سمنٹ کی قلت کی بنا پر بلڈنگ کی تعمیر کچھ دنوں کے لیے رک جاتی ہے۔ وہ گاؤں کو جاتا ہے اور ناز و کو لے آتا ہے۔ دونوں شادی کے بعد اس گیاریج میں رہتے ہیں۔ ان کے ایک بچہ بھی ہوتا ہے۔

اب "لبیرا" کا افتتاح ہے۔ مسٹر صاحب آئے ہیں۔ تقریب ختم ہوتی ہے۔ لیکن گیاریج کے سامنے چوکیدار ہے۔ گیاریج ملہوترا صاحب کا ہے اور رحمت" تازہ اوران کا بچہ اریں کھنتا ہوا بچہ سردی میں فٹ پاتھ کے حوالے ہو جاتے ہیں۔ دوسرے دن صبح بچے کی لاش ہوتی ہے۔ تازو چلا چلا کر رو رہی ہے۔

"لبیرا" کے معماروں کے لیے ہی کوئی لبیرا نہ تھا۔

"گھونگھٹ کی آنچ" اگر ایک طرف نواب حشمت خاں کی عیاشی کی داستاں ہے تو دوسری طرف صبا کے گھونگھٹ کی آنچ" میں جلنے کی کہانی ہے یا کہیے گھونگھٹ کی اس میں جان دینے کا افسانہ۔

گھر سے دلہن رخصت ہو گئی۔ صبا بت بنی کھڑی تھی۔ احمر پھولوں کا گچھا دیتا ہے۔ "رونمائی" کا تحفہ۔ فوزیہ کو صبا ستانے پر تلی ہوئی ہے۔ رومانی چھیڑ چھاڑ۔

ادھر نواب حشمت "نئی امی پرنئی امی" لاتے ہیں شراب وکباب میں مست ہیں۔ فوزیہ صبا کے لیے احمر کا پیام لاتی ہے۔ لیکن نواب صاحب دھوم دھڑاکے سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اور وسائل نہیں کہتے ہیں۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ احمر پڑھائی سے لوٹ آئے دیکھا جائے گا۔ فوزیہ چلی جاتی ہے۔

احمر واپس آتا ہے۔ اب حشمت نواب اور بھی خستہ ہیں۔ مگر ٹھاٹ باٹ باقی۔ صبا کی شادی تو نہیں کر سکتے اور احمر انتظار کیوں کرے۔ اس کی شادی ہو جاتی ہے۔ حشمت نواب احمر سے "بدلہ" لینے کے لیے ایک اور بیوی لاتے ہیں۔ حکم ہوتا ہے۔ سیج تیار رہے۔

اب شادی کا سب سے دردناک پہلو آتا ہے۔ صبا بنی سنوری اس سیج پر سو جاتی ہے زہر کھالیا ہے۔ ہاتھ میں ایک خط ہے نواب حشمت خاں نے احمر سے انتقام میں اپنی شادی رچائی تھی۔ اب وہ پچھتاوے میں بدل جاتا

ہے۔

"لہو کے رنگ" کہانی ہے اگر ایک عورت کی انا کی تو ایک دوسری عورت کی قربانی کی۔ انجم کو دس سال ہوئے آفاق سے شادی ہوئے لیکن اولاد سے محروم ہے۔ آفاق فیکٹری میں ملازم ہے۔ مسز خاں کے گھر میں کرایہ سے رہتا ہے تاکہ انجم کو بہلانے کے لیے کوئی تو ہو۔ مسز خاں کی لڑکی جوہی انجم سے گھل مل جاتی ہے۔ مسز خاں دہلی جاتی ہیں۔ جوہی انجم ہی کے پاس رہنا چاہتی ہے۔

ایک دن جوہی گر پڑتی ہے۔ زخمی ہوتی ہے۔ خون بہتا ہے۔ انجم نے اپنا خون دیا ہے۔ جوہی بچ گئی ہے۔

مسز خاں دہلی سے واپس آتی ہیں بچی کو زخمی دیکھا انجم پر بپھر گئیں اور گھر سے نکال دیا۔ فریدہ پوچھتی ہیں انجم کا خون جوہی کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ کیا وہ صرف پانی تھا۔؟

"چشم نم" میں غروب ہوتا ہوا سورج اور شفق کی لالی سورج کے قتل کا گمان ہوتا ہے۔ اور یہی کہانی کی روح ہے۔ اور روحا کے عشق کے قتل کی علامت۔

روحا کو عدنان سے عشق ہے۔ لیکن عدنان فوج میں شریک ہو جاتا ہے۔ لڑائی پر جاتا ہے۔ گرفتار ہو جاتا ہے۔ لیکن فرار ہو کر ایک بوڑھے کے گھر پناہ لیتا ہے۔ بوڑھے کے اصرار پر اور اس کی مہربانیوں سے متاثر ہو کر بوڑھے کی اکلوتی بیٹی سحر سے شادی کر لیتا ہے۔

ادھر روحا کی شادی ہاشم رضا سے کر دی جاتی ہے۔ مگر وہ تو عدنان کے عشق میں دیوانی ہے۔ وہ اس پہاڑی پر جاتی ہے۔ جہاں سے سورج کے

کے قتل کا نظارہ کیا کرتی تھی۔ پیچھے سے عدنان آتا ہے اور سحر ساتھ تھی۔ عدنان روحا سے کہتی ہے "تم نے سحر کو اپنا کر محبت کو عبادت کا درجہ دیدیا اور۔ مرجاتی ہے۔

"اس مجموعہ کی آخری کہانی "۔۔۔۔۔ اور ہم اکیلے ہیں" ایک پھول بیچنے والے کی المیہ داستاں ہے۔ میم صاحب روز آنہ اس کی دوکان کے سامنے موٹر روکتیں سو وہ سفید گلاب دیتا اور وہ چلی جاتی تھیں۔ یہ روز کا معمول تھا اور اس لڑکے، سفید گلاب اور میم صاحب کا ایک مثلث بن گیا تھا۔

پھر میم صاحب کئی روز تک نہیں آئیں۔ لڑکا خود سفید گلاب لے کر ان کے گھر جاتا ہے۔ میم صاحب کی شادی ہو رہی ہے وہ بلاتی ہیں اور وہ اس سے سفید گلاب لے لیتی ہیں۔ اب لڑکے کا روز آنہ کا معمول ہو گیا تھا کہ وہ میم صاحب کے پاس سفید گلاب پہنچائے۔

ایک دن میم صاحب نے لڑکے کو جھڑک دیا۔ اور نکال دیا۔ انھیں یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ ان کے کوئی اولاد نہیں اور گود پھول سے خالی ہے۔

اب اس پھول بیچنے والے نے دل سے دعا کی کہ میم صاحب کی گود بھر جائے۔

دعا قبول ہوئی میم صاحب کو بچہ ہونے کو ہے۔ پھول بیچنے والے کی تلاش ہوئی اور ادھر پھول بیچنے والا مضطرب ہے۔ پھول لے کر دواخانے پہنچ گیا۔

مگر۔۔۔۔۔ بچہ ضرور پیدا ہوا۔ سفید گلاب اور میم صاحب اللہ کو پیاری ہو گئیں۔

اب پھول والے کا روز کا معمول ہو گیا کہ میم صاحب کی قبر پر سفید

گلاب چڑھائے اور گھر جاکر ان کو سفید گلاب کو سینے کو لگالے۔

بہ حیثیت مجموعی دیکھا جائے اور "سسکتی چاندنی" کی کہانیوں کا "دل سے دار تک" کی کہانیوں سے مقابلہ کیا جائے تو یہ صاف ظاہر ہے کہ فریدہ نے کردار سازی کے فن میں ترقی کی ہے۔ اور جیسا کہ عنوان چشتی نے کہا ہے کہ "سسکتی چاندنی" میں فریدہ رومان کے دھندلکوں میں ہیں اور "دل سے دار تک" والی کہانیوں میں وہ ان دھندلکوں سے نکلتی محسوس ہوتی ہے۔ یعنی ان کا سارا دن کشمکش حیات میں گزر گیا۔ اور ابھی آسودگی کی صورت نظر نہیں آتی۔ اب اگلی منزل شام غم سے آگے بڑھنے رات کی تاریکی میں دیا جلانے اور اگلی صبح کو پچھلی صبح سے کیفیاتی طور پر بدلی ہوئی دیکھنے کی ہے۔ یہ صبح امید ہے۔ تمنا کا اگلا قدم اٹھانا ہے۔

اس مجموعہ کی کہانی "اے گردش دوراں" پہلی ہی کہانی ہے اور اس سفر کی اگلی منزل کو بشارت دیتی ہے۔ گلابی کی ماں سخت بیمار ہے۔ گلابی جو ابھی بچی ہے ماں کی جگہ کام کرتی ہے ماں کا علاج ممکن نہیں ہے۔ پیسہ نہیں ہے۔ کبھی کبھار کسی مہمان نے کام سے خوش ہوکر دو روپے بخشش دے دیے۔ تو وہ کچھ اچھا کھانے کے شوق میں گھر جاتی ہے لیکن ماں کی ضرورت زیادہ ہے اور وہ گولیاں لانے چلی جاتی ہے۔

دیکھیے بڑے گھر والوں کے تیور۔ ناشتے کی ٹیبل سے صاحب خانہ کی بچی نکی کے ہاتھ سے چائنا کا خوب صورت گلدستہ چھوٹ گیا اور ٹوٹ گیا۔ مگر بڑی صفائی کے ساتھ الزام گلابی کے سر تھوپا گیا۔ اور اسے مار پیٹ کر نکال دیا گیا۔

اب گلابی بھی بدل رہی ہے۔ نکی فیس کے پیسے چھوڑ کر اسکول چلی گئی یہ پورے ساٹھ روپے تھے۔ گلابی نے انھیں اٹھالیا اور رحیم چاچا کے رکشا

میں ماں کو لے کر دواخانے چلی گئی۔ وہاں لائین لگی تھی۔ اور پھر ماں کو ایمرجنسی وارڈ لے جایا گیا۔

ایسے میں صاحب خانہ دندناتے آتے ہیں۔ گلابی پر چوری کا الزام لگا کر مارتے پیٹتے ہیں۔ وہ گڑگڑاتی ہے۔ چوری نہیں کی۔ ماں کے علاج کا سوال تھا۔ پھر اطلاع ملی کہ ماں گزر گئیں۔

اب گلابی بدل چکی تھی۔ اس نے غصے میں بچے ہوئے اٹھائیس روپے "بڑے سرکار" کے منہ پر دے مارے اور رحیم چاچا سے لپٹ گئی۔ وہی اس کا آسرا تھے۔

گلابی انکور ہے یہ پودا بڑھنے کے بعد سورج کی تمازت کا مقابلہ بھی کرے گا۔ اور اپنی چھاؤں میں دوسروں کی حفاظت بھی کرے گا۔ گلابی بھی کل کی مجاہد عورت ہے۔

"کوہکن" بھی بڑی دل کو چھو لینے والی کہانی ہے۔ اور سماج کے کسی کو ستانے کے کتنے ڈھنگ ہوتے ہیں۔ قاری کو نظر آنے لگتے ہیں۔

عامر ہے۔ اس کی ماں ہے اور نیلو بہن ہے۔ گھر بھی چلے اور نیلو کی شادی بھی ہو۔ سخت پریشانی ہے عامر کو کام نہیں ملتا۔

پھر عامر کو کام ملتا ہے "راتوں کا کام ہے" کالا دھندا ہے۔ سیٹھ سلیمان کے اسمگلنگ کے دھندے میں شامل ہو جاتا ہے۔ پیسہ کما رہا ہے۔

لیکن عین اس وقت جب کہ نیلو کی شادی ہو رہی ہوتی ہے اور بارات آتی ہے، پولیس عامر کو گرفتار کر لیتی ہے۔ بارات واپس ہو جاتی ہے۔ اور عامر کو چھ مہینے کی سزا ہو جاتی ہے۔

جیل سے وہ واپس آتا ہے ماں مر چکی ہوتی ہے لیکن سیٹھ سلیمان نے

اس کے لیے خوشنما مقبرہ بنوا دیا ہے۔ جسے زندگی میں بوریا نصیب نہ تھا اسے مرنے کے بعد سنگِ مرمر ملا۔

عامر کا دوست اور شریکِ کار شرما اسے شراب خانہ لے جاتا ہے اور وہاں نیلو ایک رقاصہ کے روپ میں شراب کا جام لیے آتی ہے۔ عامر پاگل ہو جاتا ہے نیلو اور شرما دونوں کو قتل کر دیتا ہے۔

دوسرے دن اخبار میں چھپا کہ

"ایک بھائی کے ہاتھوں بہن کا قتل

قاتل نے دوست کا بھی قتل کر دیا ہے

حالانکہ ملزم پاگل پن کا شکار تھا۔"

فریدہ پوچھتی ہے ——

"پاگل کون تھا؟ عامر، شرما، سلیمان سیٹھ، نیلو یا پھر سماج

یہ جملے ہی فریدہ کے مشاہدے سے مجاہدے کی سمت سفر کی نشان دہی کر رہا ہے۔ "پاگل کا پتہ چلا جائے تو پھر مقابلے کے دو ڈیپیچ متعین ہو سکتے ہیں۔

"کنارے بے وفا نکلے" بھی ایک دل کو کچو کے لگانے والی کہانی ہے۔ ممتاز احمد کے گھر بیٹی ہوتی ہے شاد ماں۔ وہ بیٹا چاہتے ہیں۔ اور گھر چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ بڑے کاروباری آدمی بن جاتے ہیں۔

شاد ماں اٹھارہ سال کی ہو جاتی ہے۔

ممتاز احمد کاروبار سے بڑے عرصے کے بعد آتے ہیں۔ ہیتر پیر کئی خطوط ہیں۔ اس میں سے گلابی خط اٹھاتے ہیں۔ یہ شاد ماں کا خط ہے۔ بڑے دل ہلا دینے والے انداز میں باپ کو لکھا ہے۔ اور دونوں ماں بیٹی جواب کا

انتظار کرتے ہیں۔ ممتاز احمد خط پڑھ کر پچھتاوے میں پڑ جاتے ہیں۔ اور پھر فوراً شاد ماں کے گھر جاتے ہیں۔ لیکن پڑوسیوں سے پتہ چلا کہ وہ دونوں انتظار کرتی رہیں۔ پھر بستی والوں کی لعن طعن کو سہہ نہ سکی اور خودکشی کر لیں۔

اب ممتاز احمد کی سنیے۔ گھر آتے ہیں اور قلب کی حرکت بند ہوتے سے رحلت کر جاتے ہیں۔ دوسرے دن اخبار میں چھپا تھا کہ شہر کے ایک رئیس قلب کی حرکت بند ہونے سے مر گیا۔ وہ لاولد تھا اور ساری جائیداد خیراتی اداروں میں تقسیم کر دی۔

لفظ "لاولد" کے پیچھے جو ایک بزدلی اور دھوکہ کی دنیا چھپی ہے وہ قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔

"یہ بتا چارہ گر" میں اصل میں حسین ساگر میں گوتم بدھ کے مجسمے کے نصب کرتے وقت کشتی الٹ جانے کا جو حادثہ ہوا تھا اسے موضوع بنایا گیا ہے۔ دینو گاؤں سے شہر آتا ہے کہ کچھ کمائے اور بوڑھے ماں باپ کی خدمت ہو اور رما سے شادی رچائے۔

لیکن شہر میں وہ کشتی اتارنے کے کام پر آ گیا۔ کشتی الٹ گئی اور وہ جان کھو بیٹھا۔ اس کے دوست بدری ناتھ نے اس کی لاش کی شناخت کی اور پھر گاؤں گیا کہ ماں باپ کو لے آئے۔ دس ہزار کا ایکس گریشا حاصل کرے۔

بدری ناتھ کی گاؤں میں رما سے ملاقات ہوتی ہے۔ وہ دینو کے متعلق پوچھتی ہے تو اس کی چوڑیاں توڑ دیتا ہے۔ یہی خاموش لیکن دل خراش جواب تھا۔

بدری ناتھ دونوں بوڑھے ماں باپ کو شہر لاتا ہے۔ مردہ خانے لے جاتا ہے۔

کہانی ختم ہوتی ہے جب لوگوں نے دیکھا کہ حسین ساگر سے دوسرے دن دو لاشیں نکلتی ہیں اور ان کی بے نور آنکھیں پوچھ رہی تھیں۔

"یہ بتا چارہ گر ـــــــ ہمارا قصور کیا تھا۔!!"

"تلاش میں ہے سحر" میں ندا کو شکیب سے محبت ہے۔ لیکن ندا کی شادی کہیں اور کی جاتی ہے اور شوہر اسے طلاق دے دیتا ہے۔ اب وہ شکیب سے دور ہی رہنا چاہتی ہے۔ لیکن شکیب اس سے شادی کرنے پر تلا ہوا ہے۔ ندا بچنے کے لیے گھر سے نکل جانا چاہتی ہے۔ ایسے میں شکیب آتا ہے اور جب وہ چلے جانے پر اصرار کرتی ہے تو پیچھے سے شکیب کے والد آتے ہیں اور ندا کو اپنی بہو بنانے پر اصرار کرتے ہیں۔ اب ندا بھی اپنے آپ کو سپرد کر دیتی ہے۔

یہاں پر ندا کی روایتی نسوانیت کہ وہ ایک مطلقہ عورت ہے اور شکیب کو اپنانے کا اسے حق نہیں۔ شکیب کی محبت اور اس کے باپ کی فراخدلی اور روایت سے بغاوت کے جذبے کی کہانی قلم بند ہوئی ہے۔

"خون پھر خون ہے" فسادات کی کہانی ہے لیکن بربریت پر انسانیت کی فتح کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ پرانی نسل کے مولویوں اور پنڈتوں کی تنگ نظری پر نئی نسل کے نوجوانوں کی فراخدلی کی کہانی ہے۔

نجمہ زخمی ہے اور دیپک اسے دواخانے لاتا ہے۔ لیڈی ڈاکٹر سے التجا کرتا ہے لیکن اس لڑکی کو خون دینا ہے اور اسٹاک میں اس گروپ کا خون نہیں ہے۔ دیپک اپنا خون پیش کرتا ہے اور وہ مل جاتا ہے۔ پنڈت جی آتے ہیں اور دیپک سے کہتے ہیں کہ اس کی بہن آشا کے قاتلوں کے قبیلے کی لڑکی کو وہ اپنا خون نہ دے۔ ایک مولوی صاحب آتے ہیں کہ وہ ایک مسلمان لڑکی کی رگوں میں اشرف کے قاتلوں کے گروہ کے ایک نوجوان کا خون برداشت نہیں کرسکتے

لیڈی ڈاکٹران دونوں کو خون کی بوتلوں کی الماری تک لاتی ہے اور پوچھتی ہے وہ بتائے کہ اس میں کون سا خون ہندو کا ہے اور کون سا مسلمان کا۔ وہ دونوں بے بس ہو جاتے ہیں۔ دیپک کا خون نجمہ کو چڑھایا گیا۔ نجمہ دیپک کے لیے آشا اور دیپک نجمہ کے لیے اشرق۔

"پتھر کا درد" کہانی میں صبیح کینسر کا مریض ہے اور رانی سے پیار و محبت کی باتیں کرتا ہے۔ رانی کو یہ پسند نہیں پھر صبیح کا آنا بند ہوا۔ پتہ چلا کہ وہ دواخانے میں بستر مرگ پر پڑا ہے۔ رانی جاتی ہے۔ ساری کہانی آشکار ہوتی ہے۔ دوسری صبح رانی دلہن کی طرح بن سنور کر صبیح کے پاس جاتی ہے وہ آنکھیں کھول کر دلہن کو دیکھتا ہے۔ اور مر جاتا ہے۔ رانی نے وہیں چوڑیاں توڑ ڈالیں اور باہر ایک دھماکہ ہوا کسی نے پتھر کو بارود لگا کر توڑا تھا۔ یہ دھماکہ ایک علامت بن جاتا ہے اس دھماکہ کی جو رانی کی زندگی میں ہوا تھا۔

"قاتل مسیحا" بھی ایک چونکا دینے والی کہانی ہے۔

ارجن کو بہن کی شادی کے لیے جہیز کی رقم کی ضرورت تھی۔ وہ ٹرک میں لگا نجمہ لے کر جا رہا تھا کہ پانچ ہزار مل جائے اور اس کی بہن کی شادی ہو جائے ارجن گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ اور بارات واپس ہو جاتی ہے۔ ورشا اس کو برداشت نہیں کر پاتی اور خودکشی کر لیتی ہے۔

ارجن رہا ہو کر آتا ہے اور انسپکٹر شرما کو پکڑ لیتا ہے۔ انسپکٹر کہتا ہے اس نے اپنی ڈیوٹی انجام دی۔ لیکن ارجن انتقام پر تلا ہوا ہے۔ ارجن انسپکٹر کے ساتھ اس کے گھر آتا ہے۔ غصہ میں بھرا ہے شالو نے دروازہ کھولا اور انسپکٹر شرما نے شالو کو ارجن سے ملا کر کہا اسے اپنا بھائی سمجھو۔

اس وقت ارجن واپس ہو جاتا ہے۔

اب شرما کی بیٹی کی شادی کا سوال ہے۔ دینا ناتھ کا خط آتا ہے کہ بغیر جہیز کے وہ برات نہیں لائیں گے۔ شرما پر سکتہ طاری ہو جاتا ہے۔ ایسے میں کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ شالو نے شرما کو تکیے کے سہارے بٹھایا اور دروازہ کھولا۔ ارجن ہے اور اس کے ساتھ انیل۔

شرما پریشان ہے۔ ارجن کہتا ہے اسے دینا ناتھ کی شرط کا پتہ ہے اب شالو کی شادی انیل کے ساتھ ہو گی۔ انیل وہی تھا جو ورشا سے شادی نہ کر سکے برات لوٹا گیا تھا۔ باپ کے کیے پر پریشان تھا۔ گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اور اب شالو سے بغیر جہیز کے شادی کر کے اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہ رہا تھا۔

فریدہ پوچھتی ہیں۔ "ارجن آخر کون ہے — قاتل یا مسیحا؟"

"وقت سفر یاد آیا۔" میں فرح کو اسلم سے لگاؤ ہے لیکن اسلم بے اتفاقی برتتا ہے۔ فرح کو ہمیشہ نظر انداز کرتا رہا۔ وہ اس کے پیروں پر گر پڑی۔ لیکن اسے وہ ڈھونگ جانا۔

اب فرح کی منگنی ہو رہی تھی۔ یکایک فرح بے ہوش ہو گئی۔ اسلم نے اسے بھی فریب اور ڈھونگ سمجھا۔ لیکن ڈاکٹر نے کہا کہ فرح قلب کی مریضہ ہے۔ اب اسلم پچھتا چکا تھا۔ اپنے کیے پر اسے پچھتاوا تھا۔ فرح مر جاتی ہے۔

اور اب اسلم روزانہ فرح کی قبر پر پھول چڑھاتا ہے۔ اور آنسو چھلکاتا ہے۔ کیا یہ بے اعتنائی اور محبت کی توہین کا کفارہ تھا۔؟

"دل ڈھونڈتا ہے۔" میں عنبرینہ کی موٹر سے ایک شخص ٹکراتا ہے اور وہ دواخانے میں شریک کیا جاتا ہے۔ عنبرینہ نے اسے اپنے باپ کی فیکٹری

میں کام دلایا۔ وہ روز آنہ عنبرینہ کے پاس آتا۔ وہ شاعری کرتا تھا عنبرینہ اور شاعر کی ملاقاتیں رفتہ رفتہ محبت میں تبدیل ہونے لگیں۔ ایسے میں عنبرینہ کا دوست صوفی کوئی چار سال کے بعد آجاتا ہے۔

اب عنبرینہ شاعر کے پاس نہیں جاتی۔ ایک روز جاتی ہے تو صرف یہ کہنے کے لیے کہ "مجھے بھول جاؤ" اور واپس ہو جاتی ہے۔

یوں ہوتا ہے کہ شاعر صوفی کی موٹر سے ٹکرا کر مرجاتا ہے۔ اب عنبرینہ سات سال بعد وطن واپس ہوتی ہے۔ اور سیدھے شاعر کی قبر پہ پہنچتی ہے۔

"بھول انتظار کے" شاہی آنٹی کی دلدوز کہانی ہے۔ اس کا شوہر لاپتہ" ہے لوگ کہتے ہیں وہ مرگیا۔ مگر شاہی آنٹی نہیں مانتی۔ وہ سہاگن ہی کی طرح بنی سنوری رہتی ہے۔ پڑوس کی بچیوں کی ہر طرح خدمت کرتی ہے۔

عید قریب ہے۔ شاہی آنٹی کے قلب پر حملہ ہوتا ہے۔ وہ لڑکیوں کو بلوا بھیجتی ہے کہ عید کی مہندی تو لگوالیں۔ اور عید کی صبح کو وہ مرجاتی ہے۔

فاتحہ سوم تھی۔ قبر پر جہاں پڑوس تھے وہیں آفاق بھی موجود تھے۔ لوگوں کو حیرت ہوئی۔ شاہی آنٹی صحیح ہی تو کہتیں تھیں کہ وہ سہاگن تھی۔

آفاق پولیس ایکشن کے بعد پاکستان چلے گئے تھے۔ شادی بھی کرلی تھی اب وہ واپس آئے تھے تو شاہی آنٹی گزر چکی تھیں۔

"اے گردش دوراں" کی کہانیاں پچھلی کہانیوں سے کچھ اور ترقی یافتہ معلوم ہوں گی۔ ایک تو فریدہ نے کرداروں کی تشکیل میں محنت اور جدت سے کام لیا ہے۔ زبان اور بھی رواں دواں ہوگئی ہے۔ اور موضوع کے اعتبار سے بھی کہانیوں کی سماجی اہمیت بڑھ گئی ہے۔

"سسکتی چاندنی" میں زیبا، شبنم، ترنم، شمع سحر، زیبا، مونا شاہ

شفا اور چاند جیسے کردار ملتے ہیں جو محبت پر قربان ہو جاتے ہیں۔ عورت کی قربانی اور مرد کی بے اعتنائی زیادہ تر ان کہانیوں کا موضوع ہے۔ عورت کی محبت پختہ اور مرد کی محبت سیمابی محسوس ہوتی ہے۔ سماجی رکاوٹوں کے خلاف بغاوت نہیں کرتا محبت منکر ہو جاتا ہے۔

"دل سے دار تک" آتے آتے کہانیوں اور کرداروں میں اور بھی جان پڑ جاتی ہے۔ دلبر کی قربانی ہے تو خالہ کا نکماپن ہے اور امان حقیقت کو جاننے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ شاید ضرورت بھی نہیں محسوس کرتا۔

حمیدہ تو خوابوں کی تعبیر کے لیے قربان ہو جاتا ہے۔ لیکن مفلس کی دنیا نہیں بدلتی۔

لاجو صرف اپنے بچوں کی خوشی کی خاطر سہاگ کا لبادہ اوڑھے ہے۔ لیکن بستی والے اسے برداشت نہیں کر سکتے۔ بالآخر وہ اور اس کے بچے بھی فسادات کے وقت بستی والوں کو بچاتے اور قربان ہو جاتے ہیں۔ لاجو بستی والوں پر کس کر چوٹ بھی کرتی ہے۔ کہ وہ بدمعاش ہی سہی لیکن انھیں اس کے پاس پناہ لینی پڑے گی۔

نگار کا کردار بھی غیر معمولی ہے۔ الیاس نے اسے دھوکہ دیا۔ شادی کر لی۔ لیکن وہ غیر شادی شدہ ہی رہی۔ ثمر کو گود لیا۔ آخر میں الیاس کو اپنی بیٹی شیبا کی نگار کے گود لیے بیٹے ثمر سے شادی کے لیے نگار کے پاس جانا پڑا۔ نگار کو پہچانا اور پشیمان ہوا۔ لیکن نگار نے محبت کی آن رکھ لی اور شیبا کو بہو بنا لیا۔

نگار نے محبت کی عزت رکھ لی۔ جب کہ الیاس نے اسے ٹھکرا یا تھا۔ اور پھر شادی کر کے خود اپنی محبت کی توہین نہیں چاہتی تھی۔ سماج کی خدمت کے لیے ایثار کرتی ہے۔ اب ایثار کا مقابلہ میں بدل گیا ہے۔ جان دینا نہیں بلکہ دکھی جان کی خدمت کرتا ہے۔

"پلکوں کی چھاؤں میں" ایک لڑکی ہے ادب کی حفاظت اور ادیب کی یادوں کو اپنا فرض سمجھتی ہے جن کے رشتہ دار مال و دولت پر نظر رکھتے ہیں۔

آفرین اپنی انا کا شکار رہے۔ وہ بھولتی ہے کہ حسن پر بھی زوال آتا ہے لیکن گرہست اور بال بچوں کے پرسکون ماحول میں حسن لازوال ہو جاتا ہے۔ آفرین نے روشن کی محبت کو ٹھکرایا تھا کہ اسے حسن کی حفاظت کے لیے ضروری سمجھتی ہے۔ لیکن خود روشن اور شہلا کے بیٹے شنید سے اس وقت ملتی ہے جب اس کے بالوں میں چاندی چمک رہی ہے۔ اور چہرہ میک آپ کا محتاج ہو گیا ہے۔

رحمت محنت کرتا ہے اور "بسیرا" کامپلکس تعمیر کرتا ہے۔ لیکن وہی بے گھر ہے۔ اور اس کا بچہ بخار میں مبتلا جاڑوں میں فٹ پاتھ پر دم توڑ دیتا ہے دولت اور محبت کی کشمکش ظاہر کی ہے۔ فرہاد کی محنت نے شیریں تو حاصل نہیں کیا لیکن ایک بادشاہ کے فریب نے شیریں کو لوٹ لیا۔

نواب حشمت خاں کا بھی ایک کردار ہے۔ "نئی ماں" لانے اور شراب و کباب کے مزے اڑانے میں ماہر ہیں۔ مگر صبا کی شادی احمد سے نہیں کر سکتے کیوں کہ جہیز میں آن بان دکھانے کی سکت نہ رہی اور صبا قربان کر دی جاتی ہے۔

انجم کا کردار دیکھیے۔ جوہی پر جان چھڑکتی ہے اور جوہی کو اپنا خون دے کر بچا لیتا ہے۔ مگر مسز خاں جوہی کے زخم کو اس کے گر پڑنے پر نہیں انجم کی لاپرواہی سے منسوب کر کے اسے کھڑے کھڑے گھر سے نکال دیتی ہیں۔ ایک امیر اور دوسری غریب عورت کا کردار ہے۔ فرق بھی واضح ہے۔

روحا کا بھی ایک کردار ہے وہ عدنان سے عشق کرتی ہے دوسرے سے شادی ہوتی ہے لیکن وہ برداشت نہیں کرتی عدنان واپس آتا ہے لیکن اس نے سحر سے شادی کر لی کیوں کہ سحر اس بوڑھے کی اکلوتی بیٹی ہے جس نے عدنان کو پناہ

رو حا اور سنتان دونوں بھی محبت کی قربانی دیتے ہیں ہر روز شام میں پہاڑی کے پیچھے سورج قتل ہوتا ہے شفق گوارہ ہے۔

میم صاحب کا بھی ایک کردار ہے سفید گلاب سے عشق ہے لیکن ان کی گود سفید گلاب سے خالی ہے۔ صرف جوڑے کو سجا کر کیا کروں گی۔ گل فروش لڑکے کو میم صاحب سے سفید گلاب کے وسیلے سے لگاؤ ہے اس کی دعا سے میم صاحب کی گود بھرتی ہے۔ لیکن وہ خود مر جاتی ہیں۔ یہاں گل فروش لڑکے کا کردار ابھرا ہے۔

"اے گردش دوراں" کی پہلی کہانی گلابو ہی ایک غیر معمولی کردار کی شکل میں ابھرتی ہے۔ بڑے سرکار کی امیری اور گلابی کی غریبی کا تصادم ہے۔ کہانی میں تو گلابی کی ماں مر جاتی ہے لیکن لگتا ہے کہ "بڑے سرکار کی موت واقع ہوئی اور گلابی مجاہد نسوانیت کی علامت کے طور پر سماج پر چھا گئی۔

عامر کا بھی ایک کردار ہے بہن کی خاطر کالا دھندا کرتا ہے لیکن گرفتار ہو جاتا ہے۔ بہن کی بارات لوٹ جاتی ہے۔ وہ جب جیل میں ہوتا ہے تو سلیمان سیٹھ نے اس کی ماں کا تو شاندار مقبرہ بنایا۔ لیکن اس کی بہن نیلو کو بھی گی عطا فرمائی۔ یہاں عامر کا کردار دیکھئے اور انتقام کے انداز پر غور کیجئے عامر نیلو کو اور اپنے دوست سرمد دونوں کو قتل کر دیتا ہے اور پاگل ہو جاتا ہے پاگل کون ہے۔"؟

ممتاز احمد کا بھی ایک کردار ہے۔ بیٹی ہوتی ہے۔ چوں کہ بیٹا نہیں ہوا۔ اس لیے بیوی، بیٹی کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ لیکن اس وقت تک بیوی اور بیٹی دونوں ہی نے خودکشی کر لی۔

ممتاز احمد کے کردار میں فریب اور مکاری ہے تو پشیمانی بھی۔ "سسکتی چاندنی" کے بعد کی کہانیوں میں، پشیمانی کا عنصر آگیا ہے۔ جو اطراف کے مشاہدے کا ایک موضوعی پہلو ہے۔ اب مشاہدہ گہرا بھی ہوگیا ہے اور وسیع بھی۔

دینو کا انجام تو وہی ہے جو ایک دیہاتی نوجوان کا شہر میں پیسہ کمانے کے لیے آنے والے کا مقدر ہے۔ لیکن اسے گوتم کے تقدس سے جوڑا ہے۔ رما کی چوڑیاں توڑی ہیں۔ اور بوڑھے ماں باپ کو قربان کیا ہے۔

ندا کا کردار تو وہی ہے روایتی، مطلقہ عورت کا ہے جو دوسری شادی کو اپنے لیے گناہ سمجھتی ہے۔ لیکن یہاں شکیب کا کردار ہے اس سے بڑھ کر اس کے باپ کا کردار بہت بلند محسوس ہوتا ہے۔ ندا روایت میں جکڑی ہے تو شکیب اور اس کا باپ ایسی روایتوں کو جو انسانیت کو روند ڈالتی ہیں۔ توڑ دینا چاہتے ہیں۔

دیپک کا کردار تو ہندوستان کے نوجوان کے اس حوصلے کا اظہار ہے جو ہندوستانی کے روشن مستقبل کا ضامن ہے۔

صبیح اور رانی کی کہانی بھی دو کردار پیش کرتی ہے۔ صبیح کو رانی سے محبت ہے۔ اور رانی اسے بڑھنے نہیں دیتی۔ لیکن جب صبیح بستر مرگ پر ہوتا ہے۔ تو رانی جیسے خواب سے چونک جاتی ہے۔ صبیح کی وقعت اس کی نظروں میں بڑھ جاتی ہے اور پھر وہ شادی کے بغیر ہی بیوہ ہو جاتی ہے۔

فریدہ کے کرداروں میں کوئی دلہن تو بنتی ہے لیکن سہاگن نہیں۔ اور کوئی دلہن نہیں بنتی پر بیوہ ہو جاتی ہے۔

ارجن کا کیرکٹر بھی خوب ہے اور انیل کا بھی۔ وہ انتقام کے جذبے سے انسپکٹر کا سامنا کرتا ہے لیکن مسیحا بن کر انسپکٹر کو جہیز کے دکھ سے مسیحا بچا لیتا ہے۔

اور انیل اور شانو کی شادی ہو تی ہے۔ انیل اپنے باپ کی جہیز کی ضد کا کفارہ ادا کرتا ہے۔
اسلم اور فرح کے کردار بھی خوب ہیں۔ فرح کو اسلم سے محبت ہے لیکن وہ دل کی مریضہ ہے بار بار بے ہوش ہوتی ہے تو اسلم اسے ڈھونگ سمجھتا ہے لیکن جب فرح منگنی کے وقت بے ہوش ہوتی ہے اور اس کے مریضہ ہونے کی تصدیق ہوتی ہے تو اسلم شرمندہ ہوتا ہے۔ مگر اب دیر ہو چکی تھی۔
عنبرینہ کا کردار بھی خوب ہے اسے صوفی سے محبت ہے لیکن اس کی کار سے ٹکر کھانے والے شاعر کی طرف وہ راغب ہوتی جاتی ہے۔ پھر جب صوفی لوٹ آتا ہے تو عنبرینہ شاعر سے کنارہ کش ہو جاتی ہے۔ شاعر صوفی کی کار ٹکرا کر مر جاتا ہے۔ عنبرینہ سات سال بعد وطن واپس آتی ہے تو سب سے پہلے شاعر کی قبر پر جاتی ہے۔
شاہی آنٹی کا کردار بھی جاذب توجہ ہے۔ اسے یقین ہی نہیں آتا کہ وہ بیوہ ہے۔ سہاگن بنی رہتی ہے۔ لیکن اس کے مرنے کے بعد اس کا شوہر آفاق قبر پر موجود رہتا ہے۔ شاہی آنٹی سہاگن بنی رہی اس میں مگن تھی۔ اڑوس پڑوس کی بات نہ مانی اور آفاق آتا بھی ہے تو محض چھپانے کے لیے۔
اس مجموعہ کی کہانی میں پچھتاوہ بھی ہے اور وہ بھی قبر پر ظاہر ہوتا ہے۔
لیکن یہ بالکل واضح ہے کہ فریدہ کی کہانیوں میں ایک مسلسل ارتقاء ملتا ہے۔ کہانی کے مواد میں زبان وبیان میں اور کرداروں کی تعمیر میں۔ لگتا ہے فریدہ نے عورت کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور اس کی مصیبتوں کی بنیادی اور روایتی بنیادوں کو بھی محسوس کیا ہے۔ اس کا مشاہدہ تیز ہے اور وہ عورت کے ذاتی غم کو سماج کا فریدہ جانتی ہے اس نے دیکھا ہے سمجھا ہے۔ اب اسے حالات کو بدلنے کی طرف بڑھتا ہے۔

راج بہادر گوڑ۔

حیدرآباد

مصنفہ کی دیگر کتابیں

سسکتی چاندنی (افسانوی مجموعہ)

دل سے دار تک (" ")

اے گردش دوران (" ")

تلاشِ آدم (ناول) (زیرِ ترتیب)

مضامین کا مجموعہ (زیرِ ترتیب)